VOLUME: 8 ISSN: 2454-4035

ISSUE: 7-9 JULY-SEPTEMBER 2021

انوار تحقیق

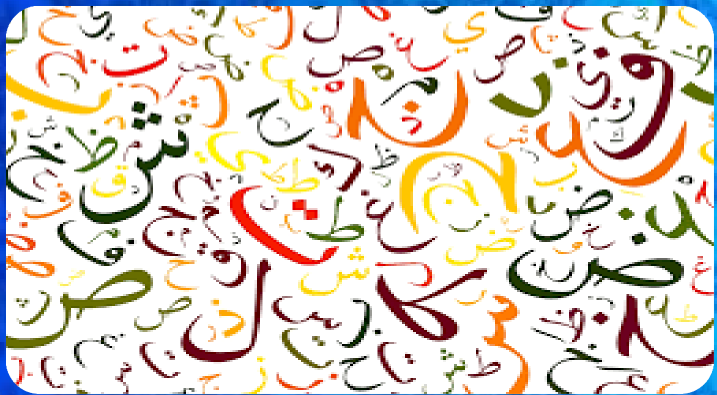

مدیران اعزازی

پروفیسر صاحبزادہ صولت علی خان

پروفیسر ای اے حیدری

مدیر اعلی

سید الیاس احمد مدنی

ANWAR-E-TAHQEEQ July-September 2021

VOLUME: 8 ISSN: 2454-4035

ISSUE: 7-9 JULY-SEPTEMBER 2021

ANWAR-E-TAHQEEQ

(Multilingual & Multidisciplinary Peer Reviewed Refereed Monthly Magazine from Qila-e-Golconda, Hyderabad, Deccan)

HONORARY EDITORS

PROFESSOR SAHEBZADA SAULAT ALI KHAN

PROFESSOR E. A. HAIDARI

CHIEF EDITOR

SYED ILIYAS AHMAD MADNI

قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد، دکن سے ماہانہ ادبی مجلّہ..................

انوار تحقیق

جلد۔۸ شمارہ۔۷تا۹ جولائی۔ستمبر ۲۰۲۱ء

زرتعاون:۔فی شمارہ:۔۱۰۰روپے سالانہ:۔۱۰۰۰روپے

نگراں:۔**سید عادل احمد**، محکمہ آثار قدیمہ، اسٹیٹ میوزیم، حیدرآباد، تلنگانہ

مدیران اعزازی:

صاحبزادہ پروفیسر صولت علی خان

پروفیسر ای اے حیدری

ایڈیٹر:۔**سید الیاس احمد مدنی**

پتہ:۔ 9/10/389، نیم باولی مسجد، کٹھورا ہاؤس، گولکنڈہ قلعہ، حیدرآباد، تلنگانہ۔008 500

موبائل نمبر:۔09966647580،09667489786 ای میل:۔anwaretahqeeq@gmail.com

مجلس ادارت

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، علی گڑھ

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی۔مانو، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل۔بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹر محمد احتشام الدین، علی گڑھ

ڈاکٹر محمد قمر عالم۔ اے ایم یو، علی گڑھ

ڈاکٹر محمد توصیف خان کاکر۔اے ایم یو۔علی گڑھ

ڈاکٹر احمد نوید یاسر، اے ایم یو۔علی گڑھ

شیخ عبدالرحیم۔جماعت اسلامی ہند۔حیدرآباد، دکن

متبع علی خان۔ایڈیٹر اردو خبر ڈاٹ ان، حیدرآباد، دکن

ریویو کمیٹی

پروفیسر مسعود انور علوی۔علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین۔لکھنؤ

پروفیسر عزیز بانو۔حیدرآباد

پی انورادھا ریڈی۔انٹیک، تلنگانہ اسٹیٹ، حیدرآباد۔چاپٹر

ڈاکٹر زرینہ پروین۔ڈائرکٹر آف آرکائیوز، حیدرآباد، دکن

ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں۔مانو حیدرآباد

ڈاکٹر ایم اے نعیم، حیدرآباد، دکن

جناب ایم اے غفار، استاد خطاطی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

کشور جھن جھن والا، ماہر مسکوکات، ممبئی

امر بیر سنگھ۔ماہر مسکوکات۔حیدرآباد

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
۱	اداریہ		۳
۲	حضرت شاہ حمایت علی قلندرؒ	پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی	۴
۳	فارسی تحقیق و تنقید میں پروفیسر نذیر احمد کا شعور آگہی	پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید	۱۵
۴	شاہکار برہمن ''چہار چمن''	پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی	۲۲
۵	سید احتشام حسین کی تنقید میں سماجی حقیقت............	ڈاکٹر مبشرہ صدف	۳۰
۶	ادب اطفال میں کرشن چند کا حصہ	سید محمد ظفر اقبال	۳۵

اداریہ

تعلیم کسی بھی معاشرے کی ترقی، استحکام اور روشن مستقبل کی ضمانت ہوتی ہے۔ یہ انسان کو نہ صرف پڑھنے لکھنے کی صلاحیت دیتی ہے بلکہ اسے شعور، فہم وفراست اور اپنی زندگی بہتر بنانے کے طریقے بھی سکھاتی ہے۔تعلیم انسان کے ذہن کی کایا پلٹ دیتی ہے، اسے جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم وآگہی کی روشنی میں لے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر ترقی یافتہ قوم نے تعلیم کو اولین ترجیح دی ہے، کیونکہ کسی بھی ملک کی تعمیر وترقی کا دارومدار تعلیم یافتہ افراد پر ہوتا ہے۔تعلیم کا مقصد صرف نمبروں کا حصول یا ڈگری لینا نہیں، بلکہ ایک ایسا ذہن تیار کرنا ہے جو سوچ سکے، تحقیق کر سکے اور اپنے معاشرے کی بہتری میں کردار ادا کر سکے۔ایک تعلیم یافتہ شخص میں نہ صرف خود اعتمادی ہوتی ہے بلکہ وہ بہتر گفتگو، بہتر رویوں اور بہتر معاشرتی ذمہ داریوں کو بھی سمجھتا ہے۔تعلیم اخلاقی تربیت کا ذریعہ بھی بنتی ہے، جو انسان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کرنا سکھاتی ہے۔معاشی ترقی میں بھی تعلیم کا کردار بنیادی ہے۔جدید دنیا میں ہنر اور علم کی بنیاد پر ہی روزگار اور ترقی کے مواقع میسر آتے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ نئی ٹیکنالوجی سے بہتر طور پر فائدہ اٹھاتے ہیں اور معاشرے کے لیے نئے راستے کھولتے ہیں۔ایک ملک کی معیشت اس وقت مضبوط ہوتی ہے جب اس کا نوجوان تعلیم یافتہ ہو، ہنرمند ہو اور نئے خیالات کو عملی شکل دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

تعلیم معاشرتی ہم آہنگی اور برداشت کو بھی فروغ دیتی ہے۔ جب لوگ باشعور ہوتے ہیں تو وہ اختلاف رائے کو بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں، ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں اور ایک پرامن معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔تعلیم خواتین کے حقوق اور ان کی سماجی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عورت نہ صرف اپنے گھر کی بہتر تربیت کر سکتی ہے بلکہ معاشرے کی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں ابھی بھی بہت سے لوگ تعلیم کی اہمیت سے پوری طرح واقف نہیں۔خصوصاً دیہی علاقوں میں بچوں کا اسکول جانا ایک چیلنج سمجھا جاتا ہے۔غربت، وسائل کی کمی، اور معاشرتی سوچ بہت سے بچوں کو تعلیم سے محروم کر دیتی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت اور معاشرہ مل کر ایسے اقدامات کرے کہ ہر بچہ، خواہ امیر ہو یا غریب، تعلیم حاصل کر سکے۔ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ تعلیم پر کیا گیا ہر خرچ مستقبل میں بہترین سرمایہ کاری ہے۔

آخر میں، تعلیم ایک روشنی ہے جو انسان کے اندر چھپی صلاحیتوں کو روشن کرتی ہے، اس کی زندگی کو سنوارتی ہے اور اسے معاشرے کا مفید شہری بناتی ہے۔قومیں اسی وقت ترقی کرتی ہیں جب ان کے افراد تعلیم یافتہ، مہذب اور آگاہ ہوتے ہیں۔لہٰذا ہمیں تعلیم کو اپنی اولین ترجیح بنا کر ایک روشن اور مضبوط مستقبل کی بنیاد رکھنی چاہیے۔

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی
صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

حضرت شاہ حمایت علی قلندرؒ

خانقاہ کاظمیہ قلندریہ میں مسند درس و تدریس کو رونق بخشنے والے اولین عالم اور صوفی حضرت شاہ حمایت علی کی پیدائش ۱۱۸۵ھ۔۱۷۶۹ء میں ہوئی (۱)۔ یہ حضرت شاہ محمد کاظم قلندر کے فرزند اوسط تھے اور مولانا شاہ تراب علی قلندر قدس سرہ سے تقریباً چار برس چھوٹے تھے۔ عہد طفولیت سے آپ کے بارے میں مشہور تھا کہ جس چیز کے بابت کچھ کہتے وہی ہوتا ''نور لاریب'' کی روایت ہے:

> در زمان پنج وشش سالگی کیفیتش چنیں بود کہ اگر درحق کسے چیزے می گفت مطابق آں ظہور می کرد چنانچہ یک بار در ہماں امساک باراں شدہ بود مردم قصبہ برائی نماز استسقاء در باغ متصل تکیہ شریفہ جمع شدند اتفاقاً ایشاں ہم مثل طفلاں بازی کناں آنجا رسیدہ پرسیدند کہ ایں جماعت کیست؟ وسر برہنہ چرااند؟ کسے بہ گفت کہ بہ طلب باراں زاری می کند گفتند عبث است بخانہ خود روند و چاہ کنند یعنی باران رحمت خواہد شد پس ہم چناں شد کہ از زبان ایشاں بر آمدہ بود (۲)۔

چشمۂ فیض کے مطابق:

> مولوی حمایت علی فاضل زبردست و لی مادرزاد بود و در بچگی ہر چہ می گفت، بظہور می پیوست (۳)۔

تعلیم و تربیت:

دس سال کی عمر میں وہ حالت جذب و کیفیت فرو ہوگئی اور تعلیم و تربیت کی طرف رغبت و توجہ ہوئی، اولاً شاہ محمد کاظم قلندرؒ سے فقہی مسائل، اذکار و اشغال خاندانی اور تصوف کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد علوم عربیہ کی تحصیل شاہ تراب علی قلندر سے کی بقول شاہ تراب علی قلندر:

> کتاب میزان منشعب از فقیر شروع کردہ بود (۴)۔

فصول اکبری حکیم محمد حیات ساکن بدہیہ لکھنؤ سے پڑھی، پھر سندیلہ جا کر مولوی قاسم علی و مولوی حیدر علی اخلاف ملا حمد اللہ شارح سلم سے تعلیم حاصل کی، کچھ دنوں لکھنؤ میں مہاراجہ ٹکیت رائے کے مدرسہ میں مولوی عبدالواجد خیر آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ آخر میں قصبہ دیوہ جا کر مولانا ذوالفقار علی نقشبندی سے ہدایہ وغیرہ پڑھ کر دستار فضیلت سے سرفراز ہوئے نزہتہ الخواطر کے مطابق:

> وقرأ المختصرات على الحكيم محمد حيات لكهنوی ثم سارالیٰ "سنديله" واخذ عن الشيخ قاسم على بن حمد الله السنديلوی ثم دخل لكهنؤ واخذ عن المفتی عبد الواجد

خیرآبادی ثم رحل الیٰ "دیوہ" ولازمہ الشیخ ذوالفقار الدیوی و تخرج علیہ(۵)۔
نورلاریب کی روایت ہے کہ:

از عمرہ دس سالگی بہ تحصیل علم پرداختند وکتب مسائل فقہیہ وعلوم ضرور یہ خاندان خود یعنی کتب تصوف واذ کار و اشغال و اعمال قلندر یہ از خدمت حضرت والد ماجد خویش تحصیل فرمودہ رجوع بہ علوم عربیہ نمودند ومختصرات عربیہ بخدمت برادر بزرگ مرشدمرشدنا حضرت شاہ تراب علی قلندرقدس سرہ شروع کردند درآں زمانہ ازحکیم محمد حیات ساکن بدہہ وبعد ازاں درسندیلہ رفتند از مولوی قاسم علی خلف مولانا حمد اللہ سندیلوی واز مولانا عبدلواجد خیرآبادی کہ مدرس مدرسہ مہاراجہ ٹکیت رائے بودند درلکھنؤ رفتہ خواندوقریب فراغ رسیدندمگر بوجہ عوائق وموانع (۶) چندروز چند از آنجا ترک نمودہ در''دیوہ''رفتہ و بخدمت حضرت مولانا ذوالفقارعلی از علمائی کامل عرفائی واصل وصاحب نسبت واز خلفائی حضرت عمدۃ الکاملین سید محمد عدل المعروف بہ شاہ لعل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ بودند ہدایہ وکتب دیگر انتہائی خواندہ از دست مبارک شاہ دستار فراغت بستند (۷)۔

نکاح و اولاد و احفاد:

''چشمۂ فیض'' کی روایت کے مطابق ان کا نکاح شیخ نجم الہدیٰ کی بیٹی سے ہوا،اولاد میں دو بیٹے اورایک بیٹی زندہ رہیں۔بیٹی کا نکاح شاہ نظام علی قلندر سے ہوا۔

چشمۂ فیض کی روایت کے مطابق:

شیخ نجم الہدیٰ دخت عمہ راقم کدخدابود دو پسر و یک دختر داردمولوی رضاعلی ومولوی باسط علی ومسماۃ حفیظ النساءزوجہ شاہ نظام بن شاہ بہرام علی (۸)۔

نفحات النسیم میں مولوی سمی علی لکھتے ہیں:

حضرت شاہ حمایت علی قلندرؒ پسر دوم حضرت شاہ محمد کاظم قلندرؒ کا نکاح شیخ نجم الہدیٰ کی بیٹی سے ہوا۔کئی اولادیں ہوئیں اور ضائع ہوئیں۔دو بیٹے مولوی رضاعلی اورمولوی باسط علی اورایک بیٹی جن کا نکاح شاہ نظام علی مذکور سے ہوا(۹)۔

مولوی رضاعلی کی ولادت ۱۹رمضان المبارک ۱۲۱۱ھ بروز پنجشنبہ ہوئی۔کتب درسیہ والدمحترم سے پڑھیں، بیعت شاہ تراب علی قلندرؒ سے ہوئے۔اجازت وخلافت بھی انہیں سے حاصل تھی مگر سلسلۂ مریدی ان سے نہیں جاری ہوا۔غدر۱۸۵۷ء سے قبل علاقہ گورکھپور میں تحصیل دار تھے، بہ عارضہ فالج بروز چہار شنبہ ۶ رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ۔۱۸۶۲ء وفات پائی اور والد کے مزار کے پائیں مدفون ہوئے (۱۰)۔

دوسرے صاحبزادے مولوی باسط علی بروز دوشنبہ ۱۵رمضان المبارک ۱۲۲۵ھ۔۱۸۱۰ء میں پیدا ہوئے تعلیم وتربیت حضرت شاہ تقی علی قلندر سے پائی۔ بیعت واجازت وخلافت شاہ تراب علی قلندرؒ سے تھی۔علاقہ کالپی و دیگر اضلاع میں تحصیل دار رہے۔۲۳ ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ۔۱۸۶۲ء بروز دوشنبہ بہ صدمۂ وفات برادر بزرگ وفات پائی اورعلاقہ بدوسہ ضلع باندہ میں متصل قبر پیارے شہید دفن ہوئے (۱۱)۔

بیعت، اجازت و خلافت:

حضرت شاہ محمد کاظم قلندرؒ نے صغر سنی میں ہی آپ کو اپنا مرید کر لیا تھا اور اجازت و خلافت سے سرفراز کیا تھا۔

نیز در آں زماں بہ سعادت بیعت در سلسلہ قادریہ رضویہ بر دست حق پرست والد ماجد خویش فائز گردیدند و منشور اجازت و خلافت در اخذ بیعت و ارشاد و امور فقر در سلاسل عالیہ ثمانیہ یعنی قلندریہ و قادریہ چشتیہ و سہروردیہ و فردوسیہ وطیفوریہ و مداریہ ونقشبندیہ۔۔۔۔بکف آوردند (۱۲)۔

فراغ حاصل کرنے کے بعد مولانا ذوالفقار علی نقشبندی خلیفہ سید محمد عدل المعروف بہ شاہ لعل بریلوی سے جازت وخلافت سلسلۂ نقشبندیہ میں حاصل کی، اس کے علاوہ شاہ ابو سعید رائے بریلوی و حاجی امین الدین محدث کاکوروی سے بھی سلسلۂ نقشبندیہ میں اجازت و خلافت حاصل تھی (۱۳)۔مولانا ذوالفقار علی نقشبندی کی وصیت کے مطابق سماع باوجود شوق کے نہیں سنتے تھے (۱۴)۔

والد محترم شاہ محمد کاظم قلندرؒ کو بھی ان کا پاس خاطر اتنا تھا کہ اگر کوئی ان کے پاس گاتا ہوتا تو وہ آپ کو دیکھتے ہی یہ کہہ کر کہ ''حمایت علی آتے ہیں خاموش ہو جاؤ'' موقوف کرا دیتے تھے (۱۵)۔

والد محترم کے انتقال کے بعد برادر محترم شاہ تراب علی قلندرؒ نے بھی اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا (۱۶)۔

درس و تدریس:

علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغ حاصل کرنے کے بعد جب وہ دیوہ سے وطن واپس تشریف لائے تو درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کیا اور اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہوئے (۱۷)۔

اس سلسلہ میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ خانقاہ میں درس و تدریس کا باقاعدہ آغاز شاہ حمایت علی قلندرؒ نے کیا اور یہ سلسلہ مشیخت کے بعد بھی جاری رہا اور تشنگان علوم ظاہری و باطنی کی سیرابی میں پوری عمر گزار دی (۱۸)۔

شاگردوں کی تعداد بہت ہے مگر تحقیق کے باوجود صرف چند حضرات کے نام معلوم ہو سکے:

(۱) مولوی حسین بخش	(۲) مولوی قادر بخش	(۳) مولوی حکیم باسط
(۴) شاہ حیدر علی قلندرؒ	(۵) شاہ تقی علی قلندرؒ	(۶) مولوی رضا علی قلندرؒ
(۷) شاہ نظام علی قلندرؒ	(۸) شاہ کرامت علی قلندرؒ	(۹) ملا محمد مراد (۱۹)

ارشاد و تلقین:

گو ان کو خرقہ ان کے بڑے بھائی شاہ تراب علیؒ نے پہنایا تاہم شاہ محمد کاظم قلندرؒ نے بھی اجازت وخلافت سے نوازا تھا اور یہ ان کے بعد صرف ۵ سال حیات رہے لیکن اس مختصر مدت میں بھی بکثرت لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا (۲۰) جس کی شہادت ''اصول المقصود'' کی ایک روایت سے بھی ملتا ہے (۲۱):

منشی فیض بخش لکھتے ہیں:

بعد حصول علم ظاہر مشغول بہ اشغال شد چنداں کہ از پدر تجاوز کردہ۔۔۔۔عالمے را از دیدن او شاہ محمد کاظم فراموش

بودند (۲۲)۔

صاحب اذکار الابرار رقم طراز ہیں:

حضرت عارف باللہ کے بعد وہ کم وبیش پانچ سال زندہ رہے مگر اس کم مدت میں ان کے اوصاف محامد اور علم وفضل وفقر وکمال کا شہرہ ہو گیا۔ اور سلسلۂ بیعت و ارشاد طریقۂ کاظمیہ ان کی ذات گرامی سے خوب جاری ہوا (۲۳)۔

تذکرہ مشاہیر کاکوری کے مطابق:

سلسلۂ قلندریہ کی اشاعت تھوڑی مدت میں ان کی ذات سے بہت ہوئی اور ایسی قبولیت عوام وخواص میں پیدا کی کہ باید وشاید (۲۴)۔

حضرت مولانا حافظ شاہ مجتبیٰ حیدر قلندرؒ نے راقم السطور سے خود بیان فرمایا کہ:

شاہ حمایت علی قلندر کی حیات میں ان کے مریدین کی تعداد برادر اکبر شاہ تراب علی قلندرؒ کے مریدین سے بہت زیادہ تھی۔

اخلاق و عادات:

شاہ صاحب کی طبیعت بچپن سے ہی فقر ودرویشی کی طرف مائل تھی لہو ولعب طعام لذیذ اور پوشاک نفیس سے بڑی نفرت تھی، نہایت وسیع الاخلاق تھے۔ والدین، استاد اور دیگر بڑوں کی خدمت بجالانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ والد محترم کی خدمت میں جو مقبولیت حاصل تھی وہ ان کے ایک خط سے ظاہر ہوتی ہے:

خط شمارا مشتاق می باشم و ہیچ یکے ضائع نکردہ ام اگر چہ پارہ کردن نوشتہ بودند گاہ گاہے می بینم بملاحظہ ثانی و ثالث درآمدہ دل خوش می شود ایں خط بسیار مسرور کرد وفہرست کتابہا نگاہداشتہ ام انشاء اللہ تعالیٰ ہمہ میسر خواہد آمد بلکہ ام الکتاب را امیدوار باشند کہ ہمہ علوم از آنجا است مارا از جناب عالی محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام وزبان مبارک حضرت مرشدی علم اولین وآخرین بشارت شدہ است ہمہ در شما ظہور خواہد کرد خاطر جمع دارند وخدارا یار دارند (۲۵)۔

نور لاریب کے مطابق:

اوصاف حمیدہ واخلاق پسندیدہ وی بسیار بودند ازاں جملہ ایں ست گاہے رغبت بہ لباس فاخرہ نہ فرمود بلکہ ہمیشہ بوضع درویشانہ ماند وجامہ ودستار وپیرہن کہ از وضع اشراف سادات بود معمول بہ خود داشت ونہ گاہے رغبت بہ سوئے حطام دنیا ومعاش ظاہری کرد باد جو یکہ چند مرتبہ براں قدرت ہم یافت چنانچہ منقول است کہ یک بار اوستاد ایشاں حضرت مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ برائی نیابت خود در عدالت ایشاں را می خواستند مگر منظور نہ فرمود و دیگر در ہماں زمانہ قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین علی خاں کاکوروی المتخلص بہ ثاقبؔ کہ در کلکتہ بعہدۂ قاضی القضاتی مامور بودند بسا صاحب جاہ وفراغت بودند برائے ایشاں تجویز روزگار کردند مگر آں را نیز قبول نہ نمودند (۲۶)۔

صاحب اذکار الابرار لکھتے ہیں:

ان کی ذات ستودہ صفات جامع علم ظاہر و باطن شریعت وطریقت سے آراستہ اور حقیقت و معرفت سے پیراستہ تھی۔نہایت وجیہ الصورت صبیح الوجہ وسیع الاخلاق تھے(۲۷)۔

انتقال:

ابھی ان کی عمر اکتالیس برس ہی کی تھی کہ ۲۵ رجب المرجب ۱۲۲۶ھ۔۱۸۷۱ء بروز جمعہ سانپ کے کاٹنے سے انتقال فرمایا(۲۸)۔

چشمۂ فیض کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"۔۔۔۔۔روز درعین عروج ہمہ چیز یعنی عروج علم ظاہر و باطن کہ عالمے راز دیدن اوشاہ کاظم فراموش بودند برائے وضو برخاست وقت جناب ملک الموت بصورت مار پیدا شدہ بر پائے مبارکش نیش اجل زد کہ صبح آں بمقام ملاءاعلیٰ صعود فرمود(۲۹)۔"

مزار حضرت مولانا شاہ محمد کاظم قلندرؒ کے مقبرہ میں جانب مغرب واقع ہے جس پر مولوی شریف الدین شریف کاکوروی کا منظومہ قطعہ تاریخ وفات نصب ہے:

حضرت مولوی حمایت علی
ابن کاظم شہ خجستہ نہاد
روز آدینہ بست و پنج رجب
آں قلندر منش بزرگ نژاد
دید از چشم دل چو عالم قدس
گشتہ از بند عنصری آزاد
۱۲۲۶ھ

خلفاء:

شاہ صاحب کے خلفاء کا ذکر تلاش بسیار کے باوجود کسی کتاب میں نہیں ملا صرف شاہ بہرام علی قلندرؒ وشاہ نظام علی قلندرؒ کی اجازت کا ذکر تذکرہ مشاہیر کاکوری میں ہے(۳۰)۔

تصنیفات:

ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں دستیاب ہیں:

(۱) رکاز الاصول شرح فصول اکبری

(۲) نورلاریب فی ترجمہ فتوح الغیب

(۳) ملہم الصواب

(۴) معدن علوی

(۱) رکاز الاصول

قاضی سید علی اکبر الہ آبادی (۳۱) کی مشہور کتاب ''فصول اکبری'' جس میں عربی زبان کی صرف کے قواعد بیان کئے ہیں اور جو عربی مدارس کے ابتدائی درجات کے نصاب میں اب تک شامل ہے اس کی نہایت عمدہ لا جواب شرح فارسی زبان میں کی ہے (۳۲)۔ کتاب ۲۵ سطری ۲۷۷ صفحات پر محیط ہے اور اپنی نفع رسانی کے سبب مطبع نول کشور و دیگر مطابع سے متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ راقم السطور کے پیش نظر ''رکاز الاصول'' کا مطبع نول کشور کا جولائی ۱۹۹۸ء کا مطبوعہ نسخہ ہے۔ سرورق کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:

بعون صناع مکین و مکان و فضل خالق زمین و زمان

شرح حامل المتن فصول اکبری در صرف

شرحیست بس شگرف و مبسوط کشاف مطالب رشیقہ حلالی مشکلات مآرب انیقہ

جامع ضوابط عربیہ حاوی قواعد صرفیہ مشتمل ابواب فصول مسمیٰ

رکاز الاصول

تصنیف لطیف قدوۂ علمائی زماں اسوۂ فضلائی دوراں عالم علوم عقلی و نقلی

مولوی حمایت علی بن مولوی محمد کاظم خلف محمد کاشف العلوی لکھنوی الکاکوروی

بصحت تمام

در مطبع نامی منشی نول کشور بہ طبع مزین مقبول جہاں شد

ابتدائی سطور میں حمد و صلوٰۃ کے بعد شرح لکھنے کا مقصد بیان کیا ہے۔

صاحب ''فصول اکبری'' نے عربی قواعد میں ''اسم مشتق کی چھ قسمیں اسم فاعل، اسم مفعول، اسم تفضیل، اسم آلہ، اسم ظرف اور اسم صفت مشبہ بیان کی ہیں۔ اس سلسلہ میں ''اسم تفضیل'' کی تعریف اور اس کے بنانے میں ''فصول اکبری'' کے متن اور ''رکاز الاصول'' کی شرح کا ترجمہ پیش ہے:

> تیسرا اسم تفضیل ہے اور (یہ) وہ اسم ہے کہ مصدر سے بنا ہوا ہے، اس چیز کے لئے فعل کی زیادتی کے ساتھ جو اپنے غیر سے متصف ہے۔ ''میزانہ فعل''، یعنی اس کی میزان افعل ہے جیسے زید عمر کے مقابلے میں بڑا ہے جو کہ موصوف کی (یعنی زید کی) زیادتی پر دلالت کرتا ہے کہ عمر ہے اس فعل میں وہ علم ہے اور فعلی پیش کے ساتھ مونث کے لئے جیسے فعلی اور اس کے بنانے کی شرط یہ ہے کہ اس کا مآخذ ثلاثی مجرد تام متصرف ہو اور زیادتی کے لایق ہو اور ظاہری لون وعیب کے معنی (اس میں) نہ ہوں لہٰذا رباعی اور ثلاثی مزید سے نہیں آتا ہے۔ اسی طرح فعل ناقص سے بھی نہیں جیسے کان کا د اور اس جیسے فعل غیر متصرف سے بھی نہیں آئے گا، جیسے نعم و بئس اور اس فعل سے جس کے معنی زیادتی اور کمی

کو قبول نہ کریں جیسے مات بناتے ہیں اور اس سے ظاہری لون وعیب نہیں ہوتا ہے لہٰذا اس میں افعل (صیغہ) صفت (تو) آتا ہے جیسے اجہل واحمق اور بعض (صرفی) اور اس کا وزن کان سے بھی جائز رکھتے جیسا کہ اصول میں ہے اور اس کو بنانے کا طریقہ رباعی سے اور ثلاثی مزید سے اور ظاہری لون وعیب سے اس طرح ہے کہ پہلے اسم تفضیل ثلاثی مجرد بنا لیں گے جس میں قوت شدت یا زیادتی کے معنی ہوں اس کے ان کو اس کی تمیز بنا دیں گے اور کہیں گے زید بڑھا ہوا ہے اس کے مقابلے میں ااستخراجاً بیاضاً وعمیاً اور اس کی جمع افعل وفعلیٰ اور افاعل جمع افعل افضل کی جمع افاضل جو جمع تکسیر ہے لیکن (جہاں تک) جمع صحیح کا تعلق ہے وہ افعلون جیسے افضلون اور فعل فا کے پیش اور عین کے زبر کے ساتھ جیسے فعل فعلی کی جمع ہے جیسے افضلون فعل فا کے پیش اور عین کے زبر کے ساتھ جیسے فعل فعلی کی جمع ہے جیسے فضل ورحمۃ کی فضلہ اور یہ جمع تکسیر ہے لیکن (جہاں تک) صحیح جمع کا تعلق ہے فعلیات ہے جیسے فضلیات میں کہتا ہوں اس جگہ اسم تفصیل کی جمع لانا اور اسم آلہ وظرف کا اور اسم فاعل ومفعول کے تثنیہ کا ذکر کرنا باعث طوالت ہے اس لئے تثنیہ کی بحث میں اس کا ذکر آئے گا۔

(رکازالاصول ص ۳۲و۳۳)

(۲) نور لاریب فی ترجمة فتوح الغیب

''فتوح الغیب'' سلسلہ عالیہ قادریہ کے سرخیل وامام الطریقہ حضرت خواجہ ابومحمد عبدالقادر جیلانیؒ معروف بہ بڑے پیر صاحب کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو عربی زبان میں ان کے صاحبزادے شیخ شرف الدین ابومحمد عیسیٰ نے مرتب کیا تھا۔ یہ رسالہ اپنی گونا گوں خصوصیات کی بنا ہر زمانے میں اہمیت کا حامل رہا ہے لیکن تصوف کا ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے یہ حرزِ جان کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت شاہ محمد کاظم قلندر قدس سرہ کے پاس چونکہ طالبان حق کی خاصی تعداد اخذ فیض کے لئے حاضر ہوتی تھی اور وہ دیگر کتب تصوف کے ساتھ ساتھ ''فتوح الغیب'' کے مطالعہ کا حکم فرماتے تھے چونکہ مریدین کی کثیر تعداد عربی زبان سے ناواقف اور مطول شروح کے مطالعہ سے قاصر تھی اس لئے شاہ حمایت علی قلندرؒ نے بموجب ارشاد والد محترم مریدین کے استفادہ کے لئے اس کا لفظی ترجمہ کیا۔ جس کی صراحت انہوں نے خود بھی تحریر فرمائی ہے (ملاحظہ ہو نور لاریب ترجمہ فتوح الغیب ص ۱۱۱)۔

کتاب سرورق اس طرح ہے:

الله نور السموات والارض

الحمدللہ کہ دریں ایوان فرخی اقتران کتاب مستطاب کامل النصاب مبرا از نقص وعیب المسمیٰ بہ

نور لاریب فی ترجمة فتوح الغیب

بہ فرمائش لایق مدح وستایش مقبول رب احد جناب منشی امیر احمد سلمہ اللہ الصمد رئیس کاکوری

درآسی پریس پریس واقع لکھنؤ طبع شد ۱۳۲۳ھ

۱۱۲ صفحات کی ۲۱ سطری کتاب متوسط تقطیع پر ۸۰ مقالات پر مشتمل ہے۔ نمونہ کے طور پر ''فتوح الغیب'' میں مرقوم مقالہ اول (عربی

) کا فارسی ترجمہ پیش ہے:

مقالہ اول

(فرمودرضی اللہ عنہ وارضاہ) فرداست مر ہرمومن راازسہ چیز درتمام احوال او یکے امرحق تعالیٰ کہ بجائی آرددوم نہی کہ بہ ہیز دازاں سوم قضاوقدر کہ راضی باشد بداں پس کمتر حال مومن آں کہ خالی نباشد در ہمہ احوال ازیں ہرسہ پس می باید کہ لازم گرداند قصد کردن ایں سہ دل خودرااو حکایت کند بہ ایں بانفس راوکارکند وبگیر وجوارح رابہ ایں ہادر ہمہ احوال خود(۳۳)۔

(۳) ملہم الصواب فی انحاء طریقہ اولی الالباب

فن تصوف میں فارسی زبان میں ۱۹ سطری ۳۲۸ صفحات پر مشتمل متوسط تقطیع کی اس کتاب کا سنہ تالیف ۱۲۲۳ھ۔۱۸۰۷ء اور پیش نظر مخطوطہ کا سنہ کتابت ۱۲۲۶ھ۔۱۸۱۱ء ہے۔

اس کتاب میں سلسلۂ ثمانیہ یعنی قلندریہ، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، کبرویہ، فردوسیہ، مداریہ، طیفوریہ اور نقشبندیہ کا سلوک جو شاہ محمد کاظم قلندرؒ نے ان کو تعلیم فرمایا تھا بالتفصیل تحریر کی ہیں۔ نیز اس کے ساتھ ساتھ بہت سے فوائد متعلق بہ سلوک تحریر فرمائے ہیں۔ اس فن میں یہ بہت عمدہ اور جامع کتاب ہے۔ صاحب اذکار الابرار اس کی تعریف میں یوں مستطیر ہیں:

> حق یہ ہے کہ اس کتاب کو لکھ کر آپ نے یہ بڑا احسان خاندان کاظمیہ پر عموماً اور دیگر سلاسل قادریہ چشتیہ وغیرہ پر خصوصاً کیا ہے(۳۴)۔

ابتدائی سطور میں حمد وصلوٰۃ کے بعد وجہ تالیف بیان کی گئی ہے۔

کتاب ایک مقدمہ اور دس مقصد وخاتمہ پر مشتمل ہے تفصیل حسب ذیل ہے:

مقدمہ: وجود علم لابدی بر سالک۔

مقصد اول: در بیان عقائد اہل سنت۔

مقصد دوم: در بیان طریقت کہ عبارت از تہذیب الاخلاق است بطور ''منہاج العابدین'' کہ از مصنفات امام غزالی است و دراں چند باب است ''عقبہ تعویہ'' ''عقبہ موانع'' ''عقبہ عوارض'' ''عقبہ بواعث'' ''عقبہ قوارح'' و''عقبہ حمد وشکر''۔

مقصد سوم: در بیان طریق معمور داشتن اوقات شبانروزی بہ اوراد واذکار۔

مقصد چہارم: درآداب معیشت بہ طور سنت ودرآں چند باب است۔ اس میں علی الترتیب آداب نکاح اور اس کے متعلقات کھانے پینے کے آداب لباس کے آداب گھر بنانے داخل ہونے نکلنے کے اور دیگر آداب بال کٹوانے کے مجلس کے کلام کرنے کے سفر کرنے کے دوستوں نیز بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کے آداب تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

مقصد پنجم: در بیان بیعت یہ ایک مقدمہ اور سات ابواب پر مشتمل ہے، مقدمہ ''در بیان ثبوت بیعت از جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم'' کے عنوان سے ہے اس کے بعد بیعت کے سنت یا واجب ہونے پر بحث ہے بعدہ کلمہ مشروعیہ شرائط شیخ، شرائط مرید، وفا نکث، بیعت اختلاف وجواز تکرار بیعت اور وقت بیعت کے الفاظ ماثورہ نیز اجازت وخرقہ اور اس کے متعلقات کا بیان ہے۔

مقصد ششم: ''در بیان طریق سلاسل ثمانیہ'' یہ ایک مقدمہ اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔مقدمہ خانوادہ اور اس کی کثرت کے بیان میں ہے۔پہلے باب میں طریقہ قلندریہ کے اذکار، طریقہ قلندریہ کے مراقبات اور طریقہ رابطہ شیخ کو تین فصلوں میں بیان کیا ہے۔اس کے بعد علی الترتیب باقی سلاسل کے سلوک کا بیان ہے جو بہت سے فوائد پر مشتمل ہے۔

مقصد ھفتم: ''در بیان موانع وعوارض سلوک کہ در اثنائے سلوک در پیش آیند'' کے عنوان سے ہے جس میں اثنائے سلوک پیش آنے والے عوارض وموانع کو نہایت شرح وبسط سے بیان کیا گیا ہے۔

مقصد ھشتم: ''در بیان طریق جذب وسلوک ونسبت بآں سبعہ اولیاءاللہ کہ نسبت سکینہ واویسیہ ویادداشت وعشق ووجد وتوحید است'' کے عنوان سے ہے۔

مقصد نھم: ''در بیان واقعات وتجلیات وانواع وکشف'' کے عنوان سے ہے اور چار فصلوں پر منقسم ہے جس میں علی الترتیب واقعات وانوار تجلی اور انواع کشف کا بیان نہایت جامع ومانع الفاظ میں کیا گیا ہے۔

مقصد دھم: ''در بیان قبض وبسط کہ سالکان را در پیش آمد'' اس میں راہ سلوک میں سالک کو پیش آنے والے قبض وبسط کو بیان کیا ہے۔

خاتمہ: ''در بعض وصایا کہ مر طالب حق را نفع باشد'' کے عنوان سے ہے اور یہ بھی بہت سے فوائد کا حامل ہے آخر میں یہ عبارت درج ہے:

(تمام شد کتاب مولفہ مولوی حمایت علی مرحوم تاریخ بست ودہشتم رمضان ۱۲۲۶ھ)

۴۔معدن علوی

تعویذ ونقش پر مشتمل فارسی زبان میں ۱۳ سطری ۲۶۶ صفحات پر مشتمل متوسط تقطیع پر ۱۲۰۶ھ کی مولفہ قلمی کتاب شاہ حمایت علی قلندر کی تصنیفات میں منفرد حیثیت کی حامل ہے۔یہ کتاب دو معدنوں پر منقسم تھی۔

(۱) معدن علوی

(۲) معدن سفلی

بدقسمتی سے حصہ دویم یعنی ''معدن سفلی'' کا متن امتداد زمانہ کے ہاتھوں تلف ہوگیا۔راقم کے پیش نظر ''معدن علوی'' کا جو نسخہ ستر فصلوں پر منقسم ہے اس میں نقوش وتعویذات کے علاوہ مختلف اوراد واعمال کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''ایں رسالہ ایست کثیر الفوائد در بیان خواص حروف واسماء وآیات وسور قرآنی ماخوذ از کتاب معتبر ایں فن درسن دوازدہ صد وشش ہجری ۱۲۰۶ھ (مطابق ۱۷۹۱ء) نبوی جمع کردہ شد بمشقت بسیار امیدی دارم ہر کسے کہ ازیں مستفید شد بہ دعائی خیر مرا یاد عمل ہائے مجربات ورد مرقوم خواہد شد۔''
>
> (معدن علوی قلمی ص ۳)

حواشی:۔

(۱) تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۱۳۵ پر سنہ ولادت ۱۱۸۹ھ تحریر ہے جو غالباً سہو کتابت ہے، کیونکہ اصول المقصود مولفہ شاہ تراب علی قلندر

میں شاہ صاحب نے ص۲۷۴ پر لکھا ہے ''ایشاں قریب چہار سال از فقیر خورد بود۔'' چونکہ شاہ صاحب کی سنہ ولادت ۱۱۸۱ھ۔۱۷۶۵ء ہے اس لئے مولانا شاہ حمایت علی قلندر کے تولد کا سال ۱۱۸۵ھ۔۱۷۶۹ء ٹھہرتا ہے جس کی تصدیق اذکار الابرار ص۳۶۲، نور لاریب ص۲۰۳ تذکرہ گلشن کرم ص۲۰، نزہۃ الخواطر ج۷ ص۱۴۷ سے ہوتی ہے۔

(۲) نور لاریب ص۳

(۳) چشمۂ فیض قلمی ورق ۱۱۱۶الف

(۴) اصول المقصود ص۴۷۳

(۵) نزہۃ الخواطر جلد۷ ص۱۴۷

(۶) اذکار الابرار ص۳۶۳ کی روایت کے مطابق مولانا عبدالواجد خیرآبادی عدالت دیوانی میں ملازم ہو گئے تھے۔

(۷) نور لاریب ص۴۷۳ تقریباً یہی عبارت مواہب القلندر ص۹ کی ہے۔

(۸) چشمۂ فیض قلمی ورق ۱۱۱۶الف۔

(۹) نفحات النسیم فی تحقیق اولاد ملا عبدالکریم از مولوی سمی علی بہ تکملہ منشی امیر احمد علوی ص۱۱۱۔۱۱۰۔

(۱۰) ملخص از مشاہیر کاکوری ص۲۷ او اذکار الابرار ص۴۰۵۔۴۰۴۔

(۱۱) تلخیص از مشاہیر کاکوری ص۶۳۔

(۱۲) نور لاریب ص۴۰۵۔

(۱۳) اذکار الابرار ص۳۶۴۔۳۶۳، تذکرہ مشاہیر کاکوری ص۱۶۳۔

(۱۴) اصول المقصود ص۴۷۴

(۱۵) ایضاً ۴۷۵

(۱۶) اذکار الابرار ص۳۶۵

(۱۷) اصول المقصود ص۴۷۴

(۱۸) ایضاً ص۴۷۷

(۱۹) اذکار الابرار ص۳۶۳ و مشاہیر کاکوری ص۱۳۶

(۲۰) مواہب القلندر ص۹

(۲۱) اصول المقصود ص۴۷۷

(۲۲) چشمۂ فیض قلمی ورق ۱۱۱۶الف

(۲۳) اذکار الابرار ص۳۶۵

(۲۴) تذکرہ مشاہیر کاکوری ص۱۳۶

(۲۵) مفاوضات ص ۴۵ مکتوب دوازدہم

(۲۶) نورلاریب ص ۱۶۹ نیز اس کی تصدیق اصول المقصود ص ۴۷۶ سے بھی ہوتی ہے۔

(۲۷) اذکارالابرار ص ۳۶۵

(۲۸) مواہب القلندر ص ۹۱ اذکارالابرار ص ۳۶۵ مشاہیر کاکوری ص ۱۳۷ تذکرہ گلشن کرم ص ۱۶۳ اصول المقصود ص ۴۷۷۔

(۲۹) چشمۂ فیض قلمی ورق ۱۱۲ الف

(۳۰) مشاہیر کاکوری ص ۱۳۶

(۳۱) قاضی سید علی اکبر حسینی حنفی الہ آبادی کو علماء میں امتیازی شان حاصل تھی علامی سعدالدین نے انہیں اپنے فرزند کا اتالیق مقرر کیا تھا اورنگ زیب کے زمانہ شاہی میں شاہزادہ محمد اعظم کی تعلیم پر مامور رہے ان کی فقاہت اور بالغ نظری کے پیش نظر عالمگیر نے لاہور کا عہدۂ قضا ان کے سپرد کیا جسے انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ یہ فتاویٰ عالمگیری کے مولفین میں تھے اور اس کے ایک چوتھائی حصہ کی نگرانی ان کے ذمہ رہی۔ ۱۰۹۰ھ ۱۶۷۸ء میں لاہور کے گورنر قوام الدین اصفہانی کے اشارے پر کوتوال شہر نے انہیں قتل کر دیا۔ عالمگیر کو جب علم ہوا تو کوتوال شہر کو قصاص میں قتل کر دیا گیا اور گورنر کو شیخ الاسلام کے حوالے کر دیا گیا جو قاضی صاحب کے لواحقین کے معاف کرنے پر اپنی جان بچا سکا۔ قاضی صاحب موصوف بلند پایہ قواعد داں تھے ان سے حسب ذیل کتابیں یادگار ہیں:۔ (۱) فصول اکبری (فارسی) قواعد میں (۲) اصول الاکبریہ (عربی) قواعد میں (۳) گہر منظوم (فارسی) عربی قواعد صرف فارسی نظم میں (۴) رسالہ لامیہ (اس کتاب میں الف، لام حرف تعریف کے استعمال پر بحث کی ہے۔

(۳۲) فصول اکبری کی متعدد شرحیں لکھی گئیں جن میں ایک عمدہ شرح ملا علاء الدین فرنگی محلی (م ۱۲۴۲ھ۔۱۸۲۶ء) کی ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند از مولوی رحمٰن علی لکھنؤ اڈیشن ص ۱۴۱۔)

(۳۳) نورلاریب ص ۳۰۴

(۳۴) اذکارالابرار ص ۳۶۴۔

☆☆☆

پروفیسرسیدمحمداسدعلی خورشید
صدرشعبۂ فارسی وڈائیریکٹرمرکزتحقیقات فارسی،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

فارسی تحقیق وتنقید میں پروفیسرنذیراحمد کاشعوروآگہی

استعماراور مابعداستعمار کے دور کے ہندوستان میں فارسی کے تخلیقی ادب کوفطری،عصری،سیاسی اورفرہنگی تقاضوں کی بنیاد پر جوزک پہنچی اس پرنوحہ گری کی شدت کوکم کرنے کے لئے یہ احساس کافی ہے کہ تحقیقی وتدقیقی اورتنقیدی لباس پہن کرعروس فارسی اسی دور میں منصہ شہود پر جلوہ گرہوئی اوراسی دور میں علمائے فارسی خواہ وہ برصغیر ہندوپاک سے تعلق رکھتے ہوں خواہ معاصرایران کے سبھی نے ان ہی میدانوں میں اپنا رأیت علم وفن افراشتہ کیا اوراسی زمین میں تخم ریزیوں کی مساعیاں کرتے ہوئے فارسی ادب کو دنیائے ادب کے جدید تقاضوں سے روشناس کرانے میں اپنی صلاحیتوں کووقف کردیا۔

بیسویں صدی کے فارسی زبان وادب کے حوالے سے راقم مقالہ نے علمائے فن وادب کی مساعیوں کے مطالعے کے لئے انہیں تین طبقات میں منقسم کرتے ہوئے پیش نظرصدی کے نصف آخر کے فارسی زبان وادب کے اجمالی اور چندسطور پر مشتمل مباحث کے ذیل میں فارسی تحقیق وتنقید میں پروفیسرنذیراحمد کے امتیازات کی تلاش وجستجو میں ایک ادنیٰ سی کاوش کی ہے۔

بیسویں صدی کے علمائے فارسی کے سنین وفات کے اعتبار سے تین طبقات کی تعیین اس طور پر کی گئی ہے کہ طبقۂ اوّل میں وہ علماء شامل ہوئے ہیں جو۱۹۴۷ء سے قبل وفات پا چکے تھے،جبکہ طبقۂ دوّم میں انہیں شامل کیا گیا ہے جن کا سال وفات استقلال ہند کے بعد سے لے کر ۱۹۸۰ء کے درمیان ہےاورطبقۂ سوّم میں وہ محققین وناقدین شامل ہیں جنہوں نے ۱۹۸۰ء کے بعداس دارفانی سے رخت سفر باندھا۔

اس طرح طبقۂ اول میں محمدحسین آزاد(م۱۹۱۰ء)،الطاف حسین حالی(م۱۹۱۴ء)،شبلی نعمانی(م۱۹۱۴ء)،پروفیسرمحمدشفیع(م۱۹۴۲ء)، پروفیسرمحمداقبال(م۱۹۴۶ء)،پروفیسرمحمودشیرانی(۱۹۴۶ء)،اور پروفیسرعبدالغنی جبکہ طبقۂ دوم میں سیدسلیمان ندوی(م۱۹۵۳ء)،پروفیسرسید ہادی حسن(م۱۹۶۳ء)،پروفیسرنجیب اشرف ندوی(م۱۹۶۸ء)،ڈاکٹرمحمداسحٰق(م۱۹۶۹ء)،پروفیسرضیاءاحمد بدایونی(م۱۹۷۳ء)،پروفیسروحیدمرزا(م ۱۹۷۶ء)اورطبقۂ سوم میں امتیازعلی خاں عرشی(م۱۹۸۰ء)،پروفیسرقاضی عبدالودود(م۱۹۸۴ء)،پروفیسرنورالحسن انصاری(م۱۹۸۷ء)،سید صباح الدین عبدالرحمٰن(م۱۹۸۷ء)،پروفیسرسیدحسن(م۱۹۸۸ء)،پروفیسرنذیراحمد(م۲۰۰۸ء)،پروفیسرامیرحسن عابدی(م۲۰۱۱ء)، پروفیسرولی الحق انصاری(م۲۰۱۴ء)پروفیسروارث کرمانی اور پروفیسرنبی ہادی(م۲۰۱۶ء)شامل کئے گئے ہیں۔

مذکورہ تینوں طبقات کے محققین ومنقدین میں دوقسم کے علماء ہیں۔ایک قسم توان افراد کی ہے جن کے ذہن وفکر کی نشوونما مغرب کی کارگاہ میں مستشرقین کے زیرسایہ ہوئی،جبکہ دوسری قسم ان افراد کی ہے جن کی ذہنی بالیدگی اورفکرونظر کی تربیت خوداسی برصغیرہندوپاک یاسرزمین

ایران کی مرہون منت ہے۔اورقسم اول میں پروفیسرمحمد شفیع، پروفیسرمحمد اقبال، پروفیسرمحمود شیرانی، پروفیسرعبدالغنی، پروفیسرسید ہادی حسن، پروفیسر وحیدمرزا اور پروفیسر قاضی عبدالودود جیسے نابغۂ عصر شامل ہیں جبکہ قسم دوم میں محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، سیدسلیمان ندوی، پروفیسرنجیب اشرف ندوی، ڈاکٹرمحمد اسحٰق، پروفیسرضیاءاحمد بدایونی، امتیازعلی خاں عرشی، پروفیسر نورالحسن انصاری، سیدصباح الدین عبدالرحمٰن، پروفیسر سیدحسن، پروفیسر نذیراحمد، پروفیسرامیرحسن عابدی، پروفیسر ولی الحق انصاری، پروفیسروارث کرمانی اور پروفیسرنبی ہادی جیسے محققین ومنتقدین اور مفاخر فارسی شامل ہیں۔

طبقۂ اول کے محققین وناقدین پرگفتگومحل نظرنہیں لیکن طبقۂ دوم وسوم کے صاحبان فضل وکمال کے علمی وتحقیقی چندقابل ذکرکارناموں کے اجمالاً ذکر کے بعداصل موضوع پرگفتگومناسب ہوگی۔

مذکورہ دونوں طبقوں کے علماوفضلا اس برصغیر کے وہ نامورفرزند ہیں جنہوں نے تحقیق وتدوین متون میں دیوان قاسم کاہی، دیوان فلکی، دیوان ہمایوں بادشاہ، رقعات عالمگیری، مثنوی نہ سپہراورخزائن الفتوح اور نقد وانتقاد میں خیام، پرشین نیویگیشن، تجاری ہندو، طبابت ہندو، اخلاق ہندو، سخنوران ایران درعصرحاضر، شعرفارسی معاصر، چہارشاعرۂ برجستۂ ایران، تذکارسلف، سمن زار، امیرخسرواحوال وآثار، ایولیوشن آف غالبس پرشین پوئٹری، ڈریمس فارگوٹن، بیدل، مغلوں کے ملک الشعراء، طالب آملی، اے ڈکشنری آف انڈو پرشین لٹریچر، ہسٹری آف انڈو پرشین لٹریچر وغیرہ جیسے علمی وتحقیقی کارناموں سے فارسی ادب کوثروتمند کیا۔

سنین وفات کے اعتبار سے منقسم ان طبقات میں سے طبقۂ سوم میں جاگزیں پروفیسرنذیراحمد کا شمار درجۂ اول کے محققین وناقدین میں ہوتا ہے جن کا ذہنی وفکری عروج وارتقاء کسی خمخانۂ مغرب کا مرہون منت نہیں بلکہ سراسرمشرق کا ہی فیضان نظر ہے۔اس مشرقی کرشمہ وفیضان نے پروفیسر نذیراحمد کی عرفانِ ادب اورسلوکِ تحقیق وتنقید میں ایسی تربیت کی کہ انہیں خانقاہ تحقیق وتنقید کا مرشد کامل بنادیااوربیسویں صدی کے نصف آخر کے اس عظیم محقق ومنتقد کے علمی کارنامے کسی زاویۂ نگاہ سے بھی دونوں طبقات ماقبل کے علماء و فضلائے ادب فارسی سے کمتروکہترنہیں بلکہ معاصرایران کے مشاہیرمحققین وناقدین کے کارناموں سے چشمکیں کرتے نظرآتے ہیں۔

پروفیسرامیرحسن عابدی جوپروفیسرنذیراحمد کے دیرینہ دوست رہے تھےاور فارسی ادب کی دنیا میں ایک مرتبۂ شامخ پرمتمکن ہیں، نذیراحمد کے بارے میں اظہارخیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

> ”...ایک زمانہ تھا کہ شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن، پروفیسر ہادی حسن، پروفیسر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر وحیدمرزا، پروفیسر مسعودحسن رضوی، پروفیسر زبیر صدیقی، پروفیسرعبدالمعید خاں، پروفیسر نظام الدین، پروفیسرنجیب اشرف ندوی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر اسحٰق وغیرہ کی خدمت میں حاضر ہونے اوران سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔آج وہ ہم میں نہیں ہیں، لیکن ان کی سیرت اور

کارنامے ہمارے لئے مشعل ہدایت ہیں۔مگر ان سب بزرگوں کو ملا کر اگر میں پروفیسر نذیر احمد صاحب سے مقابلہ کروں تو میں بلا تأمل کہہ سکتا ہوں کہ کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے آپ کے علمی کارنامے ان سب پر بھاری ہیں۔''

(پروفیسر نذیر احمد درنظر دانشمندان؛ص۱۹)

آگے چل کر پروفیسر عابدی مرحوم راقم ہیں؛

''ایران میں علامۂ قزوینی پہلے شخص تھے جنھوں نے تحقیق کا راستہ دکھلایا۔اس کے بعد ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، پروفیسر محمد معین، دہخدا، ڈاکٹر خانلری وغیرہ جیسے صاحبانِ علم پیدا ہوئے جنھوں نے دقتِ نظر اور جزئیات کی چھان بین پر زور دیا۔ہندوستان میں حافظ محمود شیرانی پہلے شخص تھے جنھوں نے پرانے روایتی انداز کو بدلا اور تحقیق و تدوین کا راستہ دکھلایا۔ان کے روحانی شاگرد ڈاکٹر صاحب (یعنی پروفیسر نذیر احمد) نے اس انداز کو اپنایا۔قاضی عبدالودود ان سب کے مداح اور غیر معمولی علمی شخصیت کے حامل تھے۔نیز انہوں نے ہمیشہ پروفیسر نذیر احمد صاحب کے کاموں کی ستائش کی۔مجھے بھی قاضی صاحب کی صحبت میں بارہا استفادہ کا موقع ملا ہے۔ڈاکٹر علی اصغر حکمت نے بھی نذیر صاحب کے تحقیقی مقالات کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔''

(ایضاً؛ص۲۰)

پروفیسر عابدی کے بیان کے مطابق اپنے سفر ایران سے قبل ہی پروفیسر نذیر احمد فارسی ادب کے دنیائے تحقیق میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔فارسی ادب میں تحقیق وتنقید کی ابتداء کا سہرا ایران میں علامۂ قزوینی اور ہندوستان میں علامۂ شیرانی کے سر ہے اور بلا تأمل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کو عروج و کمال پر پہنچانے کا افتخار مولانا عرشی، قاضی عبدالودود اور پروفیسر نذیر احمد کو حاصل ہے۔

فارسی تحقیق و تصحیح متون میں پروفیسر نذیر احمد کے کارنامے بڑے وقیع اور پرارزش ہیں جس کے ثبوت میں ان کے مصحح دیوان سراجی، دیوان عمید لوئکی، مکاتیب سنائی اور دیوان حافظ کے نام لئے جا سکتے ہیں جو محکِ اعتبار و استناد پر سرہ اور خالص ہیں، اور فارسی ادب کی دنیا میں نذیر احمد کو قد آور تشخص کے زمرے میں لا کھڑا کرتے ہیں۔پروفیسر نذیر نے تحقیق میں متون کو مہمات سے جانتے ہوئے نہایت جانفشانی، عرق ریزی اور جگر کاوی کے ساتھ ان متون کی تصحیح و تدقیق کے اہم کارنامے انجام دیئے ہیں اور تصرفات و تحریفات کی نشاندہی نہایت بالغ نظری کے ساتھ کر کے سرہ و ناسرہ کو متفاوت کر دیا ہے۔

تصحیح متون ادبی کے علاوہ پروفیسر نذیر احمد کے اہم کارناموں میں لسان الشعراء، فرہنگ قوّاس، مدارالافاضل، فرہنگ زفان گویا وغیرہ جیسی فرہنگوں کی تلاش وجستجو اور لغات کی تحقیق وتدقیق ہے جس کی بنا پر انہیں فارسی کے معتبر ومستند لغت شناسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان فرہنگوں کی تحقیق وتدقیق اور لغات کی چھان پھٹک میں پروفیسر نذیر نے کیسی کیسی جانفشانیاں کی ہیں، اہل علم پر عموماً اور ان کے حلقۂ تلمذ کے افراد پر خصوصاً ظاہر و باہر ہیں اور ان کا ذکر تطویل لا طائل ہوگا۔

علمی وتحقیقی مقالات جس کثرت سے پروفیسر نذیر نے تحریر کئے ہیں وہ ان کے علمی تبحر اور فکر ونظر کے عمق و وسعت کی بیّن دلیل ہیں۔ ذیل میں پروفیسر نذیر احمد کے بعض علمی وتحقیقی مقالات پر کچھ گفتگو اور ان کے پس منظر میں ان کے عالمانہ امتیازات کا ایک نقش کھینچنے کی کچھ کوشش کی جاتی ہے۔

''اردو وفارسی کی ایک تاریخی تلمیح۔ایاز'' کے عنوان سے پروفیسر نذیر احمد کا مقالہ ان کی علمی بصیرت اور تعمق نظر کا نمونہ ہے، جس میں بعض مستند تاریخی اشاروں کی بنیاد پر انہوں نے ایاز کی حیات کا ایک نقش اپنی عالمانہ بصیرت سے کھینچا ہے۔ محمود غزنوی اور اس کے جانشینان اول وپنجم یعنی مسعود اور فرخزاد کے عہد میں ابوالنجم ایاز بن اویماق یا ایماق کے ظہور سے لے کر عروج اور وفات تک کے احوال تاریخ بیہقی، دیوان فرخی، زین الاخبار، طبقات ناصری، دیوان منوچہری، تاریخ بناکتی اور مجمل فصیحی جیسے اصلی منابع اور مقالات شیرانی و شعرالعجم جیسے ثانوی مآخذ سے مرتب کر دیئے ہیں۔

یہ مقالہ مجموعی طور پر چار ذیلی عناوین؛ دور محمود، عہد مسعود غزنوی، عہد فرخزاد بن مسعود اور محمود وایاز کی داستان عشق میں منقسم ہے۔ پروفیسر نذیر احمد کی تحقیق کے مطابق محمود غزنوی کے عہد میں ایاز اگر چہ مشہور ہو چکا تھا لیکن سیاسی امور میں اس کا کچھ دخل پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا البتہ اس کی موجودگی کے شواہد ہیں۔ پروفیسر ممدوح نے نہایت محققانہ انداز میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ محمود کے دربار سے انتساب کے وقت ایاز اپنے عنفوان شباب کے دور میں تھا اور اس امر کی تحقیق میں ایاز کی مدح میں ۴۲۱ھ میں فرخی کے کہے گئے ایک قصیدے کو بنیاد بناتے ہوئے اسی سے اس نکتے کا استنباط کیا ہے کہ ایاز کا سال پیدائش ۳۹۲ھ کے آس پاس رہا ہوگا اور محمود کی تخت نشینی ۳۸۷ھ کے وقت وہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

ایسی صورت میں ممکن ہے کہ ۳۹۲ھ کے اردگرد پیدا ہونے والا ایاز اٹھارہ۔بیس سال کی عمر میں دربار محمود سے وابستہ ہوا ہو کیونکہ اس کی وابستگی کے شواہد تو تاریخ بیہقی جیسے ماخذ سے متیقن ہیں۔

ایاز کے سن ولادت کے قیاس میں پروفیسر نذیر نے فرخی کے جس شعر کو استنباط امر میں شاہد بنایا ہے وہ؛

یکی گوید کہ آن سرویست بر کوہ
یکی گوید گل تازہ ست پربار

ہے اور فرخی کے ایاز کو ' سرو' اور ' گل تازہ' قرار دینے سے اس کی عمر تیس سال کے حدود میں رکھ کر اپنے قیاس کی عمارت تعمیر کی ہے اور اس طرح فردوسی و ایاز کے مشہور واقعے متعلق بہ ملاقات اور فردوسی کی عدم توجہی اور فردوسی کے ایاز کی تعریف میں کہی گئی رباعی اور شاہنامہ کا صلۂ موعود نہ ملنے کی صورت میں ہجو یہ اشعار کا سر بمہر لفافہ ایاز کو سونپے جانے کے تمام مشہور و متداول روایات کو غیر مستند اور مفروضہ قرار دیا ہے۔

پروفیسر نذیر کی تحقیق کے مطابق سلطان مسعود غزنوی کو تخت نشین کرنے اور اس کے سر پر آرا بھائی امیر محمد کو تخت سے بے دخل کرنے میں ایاز نے اپنی کم عمری کے باوجود اعلیٰ سیاسی تدبر اور گہری حکمت عملی سے کام لیا۔ جس کے صلے میں مسعود کے دربار میں اسے اعزاز و اکرام حاصل رہا۔ جبکہ تاریخ بیہقی کے ایک ذکر، جس سے سلطان مسعود کی نگاہ میں ایاز کی ناتجربہ کاری اور عدم پختگی کی بات مترشح ہوتی ہے فاضل محقق کو حیرت و استعجاب بھی ہے لیکن اس امر میں وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے ہیں اور یہ مسئلہ لاینحل رہا ہے جس پر کام کا موقع ہے۔

عہد فرخزاد بن مسعود میں ایاز کے تعلق سے پروفیسر نذیر احمد کی فکر رسا اور ذہن متجسس کو کوئی اہم بات یا قابل ذکر حیثیت نظر نہیں آتی اور بالآخر اسی غزنوی سلطان کے عہد حکومت میں ۴۴۹ھ میں ایاز کی وفات ہو جاتی ہے۔

اس مقالے کے آخری ذیلی عنوان یعنی ''محمود اور ایاز کی داستان عشق'' کے ضمن میں پروفیسر نذیر، محمود کے ایاز سے اس خاص جذبۂ محبت کے قائل نظر آتے ہیں جو فارسی و اردو ادب میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔ جبکہ علامہ شبلی اس زمانے کے ایسے غیر مشروع اوضاع و روش معاشرہ پر اپنی شعر العجم میں متعجب ہیں اور محمود کی مدح میں کہے گئے قصائد میں حسن ایاز کے برملا اظہار اور اس پر محمود کے اظہار پسندیدگی پر انگشت بدنداں ہیں۔ جبکہ علامۂ شیرانی شبلی کے اس خیال کی اپنی تنقید شعر العجم میں تردید کرتے ہیں کہ وہ قصائد جس میں حسن ایاز کا ذکر ہے وہ محمود کی مدح میں ہیں، بلکہ اسے مدح سرائی مسعود قرار دیتے ہیں۔ اس زمانے کے تمدنی اوضاع میں ایسے سوقیانہ اور پست عاطفۂ التفات کی موجودگی کے ثبوت میں پروفیسر نذیر احمد تاریخ سیستان کے حوالے سے یعقوب لیث کے ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے اپنا محققانہ فیصلہ یہ سناتے ہیں کہ؛

> ''اس دور میں معاشرے میں اخلاقی پستی کی علامتیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ اس پر نہ حیرت کرنا چاہیئے اور نہ اس کے دفاع کی کوشش، غلامی بڑی لعنت ہے اور ہزاروں معائب کی بنیاد بھی۔''

(مقالات نذیر؛ غالب انسٹی ٹیوٹ؛ ص ۹۳)

تدین و تقویٰ اور اسلامی تاریخ میں بت شکن کے لقب سے ملقب اس ہیرو کی ایاز پرستی اور ان کے حسن و عشق کی مشہور داستانوں صحت و صداقت کی، پروفیسر نذیر احمد اپنی تحقیقات کی روشنی میں تائید و توثیق کرتے نظر آتے ہیں۔ اس مقالے میں پروفیسر موصوف نے شعرائے فارسی کے یہاں تلمیح و تشبیہ اور استعارے کی مستحکم صورت اختیار کر چکے محمود و ایاز کے قصۂ عشق کی اساتید سخن کے موجود نمونوں کے ذکر

کے بعد اپنے مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہوئے آخر میں تحریر کرتے ہیں کہ؛

"...ایاز کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ چند مآخذ کی بنیاد پر یہاں پیش کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دقیق مطالعے سے نئے ماخذ معلوم ہونگے اور ان کی بنیاد پر ایک اہم سیاسی شخصیت کی اصل تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آئے گی۔

ایاز کی زندگی کے مطالعے سے یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ غزنوی دور میں محل کے غلاموں کا دستہ اس وقت کے فوجی نظام میں کیا حیثیت رکھتا تھا۔ تاریخ کے طالب علم کے لئے یہ امر کافی اہمیت رکھتا ہے۔ رہا ادب کا طالب علم، تو اس کا مطمح نظر تو ایاز کی داستان عشق ہے۔ یہ داستان اصلی ہو یا فرضی اس کے لئے (یعنی ادب کے طالب علم کے لئے) دونوں برابر ہیں، لیکن تاریخ حقیقی اور فرضی داستان کے درمیان حد فاصل کھینچتی ہے۔ اس کا صحیح ادراک ادب و تاریخ دونوں کے طالب علم کے لئے دلچسپی کا یکساں سامان رکھتا ہے۔"

(ایضاً؛ص۹۴)

اس مقالے اور اس جیسے معتدبہ مقالات سے پروفیسر نذیر احمد کی تحقیقی و علمی وجاہت اور عالمانہ و فاضلانہ جلالت کا ایک دلکشا شبستاں تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ موضوع کے انتخاب، مآخذ و منابع کی تلاش اور اس میں متعلقہ موضوع سے متعلق تفحّص و تجسّس، بعض رائج و مشہور داستانوں کے ردو ابطال اور بعض کی تصحیح و تصدیق اور نتائج کے استخراج کے ساتھ ساتھ کہیں مبہم اور کہیں برملا محققانہ فیصلوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نذیر احمد کی جودت طبع اور فکر رسا کس طرح ادب کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ تھی اور ان کا محققانہ مقیاس و معیار کیسی فاضلانہ بصیرت سے مملو تھا۔

ایسے ہی پروفیسر نذیر احمد کے دوسرے مقالات مثلاً "رواں۔ تلفظ اور معنی" کا مطالعہ بھی یہ باور کراتا ہے کہ صرف ایک لفظ "رَواں" یا "رُواں" کے تلفظ کی تعیین میں نذیر احمد کے پرتجسس ذہن نے کیسی کیسی کاوشیں کی ہیں اور چار حروف پر مشتمل اس لفظ کے حرف اول کی حرکت کے تعین کے لئے ان کی عالمانہ بصیرت نے فرہنگ اسدی طوسی، فرہنگ قواس، صحاح الفرس، معیار جمالی، دستورالافاضل، اداۃ الفضلا، زفان گویا، بحرالفضائل، شرف نامہ، تحفۃ السعادۃ، مؤیدالفضلا، فرہنگ جہانگیری، مجمع الفرس، فرہنگ رشیدی، برہان قاطع، سراج اللغۃ، غیاث اللغات، فرہنگ نظام، فرہنگ معین اور لغت نامۂ دہخدا جیسی پانچویں صدی ہجری سے لے کر پندرہویں صدی ہجری تک کی بیس فرہنگوں کے عمیق مطالعے اور لفظ رواں کے معنی و شواہد کی چھان پھٹک کے بعد دس صدیوں پر محیط اس لفظ کے تلفظ کی داستان رقم کرتے ہوئے اپنا

یہ محققانہ فیصلہ سنادیا کہ دونوں حرکات کے ساتھ اس لفظ کا تلفظ درست ہے۔ہم جیسے معمولی طلبائے فارسی تو ایک دو فرہنگوں کے حوالے سے نتیجہ گیری کر لینے کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن پروفیسر نذیر احمد کے غیر معمولی ذہن اور فکر بدیع کے تجسس کو ایک چشمے سے سیرابی نہیں ہوئی تو دس صدیوں پر محیط فرہنگوں کے سرچشموں میں اپنے مقصود کی تلاش میں شناوری کرتے کرتے بلآخر گوہر مدعا تلاش کر کے تحقیق کے میدان میں اپنی جولانی طبع کا سکہ جمادیا اور ایک لفظ کے معنی و تلفظ کی ایک ہزار سالہ داستان لکھ ڈالی۔

غرض پروفیسر نذیر احمد کے تحقیقی مقالات ہوں یا تنقیدی، تصحیح متون کی ریاضتیں ہوں یا قدیم فرہنگوں کی تدوین کے مجاہدات، تخریج وتعلیق کی کرشمہ سازیاں ہوں یا منابع و مصادر سے انہار مقصود کی کاوشیں ہر جگہ ان کا تیشۂ طبّاع و تجسس فرہاد وار ساری عمر اس طرح مشغول عمل نظر آتا ہے کہ جس کی نظیر اب مفقود نظر آتی ہے اور اس ہیچمدان کے دل سے فقط یہ نکلتا ہے کہ؛

ع خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

منابع:

۱۔ پروفیسر نذیر احمد درنظر دانشمندان؛ص۱۹

۲۔ لسان الشعراء، تصحیح پروفیسر نذیر احمد

۳۔ فرہنگ قوّاس، تصحیح پروفیسر نذیر احمد

۴۔ مدارالافاضل، تصحیح پروفیسر نذیر احمد

۵۔ فرھنگ زفان گویا، تصحیح پروفیسر نذیر احمد

۶۔ مقالات نذیر؛ غالب انسٹی ٹیوٹ؛ص۹۳

☆☆☆

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی

صدر شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

شاہکارِ برہمن ''چہار چمن''

سرزمین ہند کو یہ شرف حاصل ہے کہ علمی ادبی مذہبی اور تاریخی اعتبار سے یہ انتہائی قدیم اور تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہی ہے ہندوؤں کے پراچین گرنتھوں شاستروں ویدوں اور دھارمک رچناؤں میں اس پوتر دھرتی کا ذکر کثرت سے ملتا ہے جس طرح آسمانی صحیفوں میں عرب مصر فسلطین اور یمن کے علاقوں کی داستان اور قصص الانبیاء ہیں اسی طرح پرانوں کے مطالعہ سے اس علاقہ کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہوتا ہے یہ سرزمین انتہائی قدیم پاک پوتر اور پرنور رہی ہے اس کو سادھوسنتوں رشیوں منیوں تیاگیوں بیراگیوں کی عبادت گاہ اور دیوی دیوتاؤں کا مسکن ہونے کا بھی شرف حاصل ہے ہندوؤں کی قدیم دھارمک کتابوں پرانوں اور تاریخوں کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کی زبان ثقافت اور تاریخ دنیا کی قدیم ترین تاریخوں میں سے ایک ہے اس سرزمین کے بہت سے حصے دھارمک اعتبار سے انتہائی اہم ہیں جس میں بنارس، اجودھیا، پریاگ راج، ہریدوار، وندھیاچل، اندرپرستھ، سارناتھ، پنجاب، کشمیر، تروپتی، اوجین، دکن، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، سناتن دھرم، سکھ دھرم، بودھ دھرم، جین دھرم، کے ساتھ ساتھ یہاں مسلمانوں کے بھی اہم اصلاحی وفلاحی مراکز شامل ہیں اس سرزمین پر صوفیوں نے بھی دستک دی اور اپنے رموز و نکات سے اسلام کی ترویج و اشاعت میں گراں قدر کارنامے انجام دئے، جب یہاں اہم تجارتی مراکز ہوا کرتے تھے اور دولت سے یہ ملک مالا مال تھا اس وقت بھی صوفیوں نے اس دنیا کو فانی قرار دیکر اسے آزمائش اور امتحان گاہ بتائی اور ہمیشہ آخرت کو اس فانی دنیا پر فوقیت دی، جب مختلف حملہ وروں نے اس سرزمین پر خوں ریزی اور قتل و غارت گری کر کے دھن دولت کو لوٹا اس وقت بھی یہاں کے عالموں صوفیوں اور یوگیوں نے اس طرف توجہ نہیں دی اور صرف عاقبت بنانے کی فکر میں دنیا کو ترک کرنے میں ہی اپنی بھلائی سمجھی اسی وجہ سے یہاں نہ صرف متعدد حملے ہوئے بلکہ مختلف حکومتیں بھی قائم ہوئیں، ان حکومتوں میں بہت سی حکومتیں تو صرف اس لئے قائم ہوئیں کہ وہ یہاں سے مستفیض ہوتی رہیں اور یہاں کے قیمتی زر و زیورات کو حاصل کریں جبکہ چند حکومتیں ایسی بھی قائم ہوئیں جنہوں نے اسے ہی اپنا ملک سمجھا اور مستقل قیام کر کے یہاں ترقی و ترویج کے لئے کوشاں بھی رہے ان حکومتوں میں سب سے اہم حکومت مغلیہ حکومت ہے جس کے عہد میں یہاں ہمہ جہت ترقی بھی ہوئی اور علم و ہنر اپنے نکتۂ عروج پر پہنچ گیا اسی زمانہ میں یہاں فارسی کو بھی انتہائی عروج حاصل ہوا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی نشو و نما کا سلسلہ مغلوں سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا اور بتدریج ارتقائی منزلیں طئے کر رہا تھا غزنوی فرمانرواں، مملوک سلاطین، خلجی، لودی، بہمنی اور تغلق گھرانوں نے اپنے اپنے عہد اور اپنی حدود سلطنت میں بساط کے مطابق فارسی زبان و ادب کے فروغ کے لئے کوشاں رہے مغلوں کے زمانہ میں اکبر و جہانگیر کے دور میں فارسی کی ترقی اپنے انتہا کو پہنچ گئی مختلف

زبانوں سے مقبول کتابوں کے تراجم ہوئے متعدد موضوعات پر تصانیف وتالیف کا سلسلہ جاری رہا اور علم کے بیشتر جواہر ریزے فارسی زبان میں منتقل ہوتے رہے جبکہ شاہجہاں کے زمانہ میں فارسی صرف سرکار یا امراء کی زبان نہ ہو کر عوام کی زبان بن چکی تھی اور بیشمار علماء ادباء مورخین محققین اور مترجمین سے اسکا دربار بھرا ہوا تھا جہاں ہر علاقہ اور ہر مزاہب کے لوگ علم و ہنر کی خدمات انجام دے رہے تھے مسلمانوں کے دوش بدوش بہت سے دیگر مزاہب کے لوگ بھی ایسے تھے جنہوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں انہی علماء میں ایک مشہور ومعروف نام چندر بھان برہمن کا تھا جو انتہائی عالم فاضل،محقق،مورخ،پنڈت اور دیگر مزاہب کے رموز ونکات سے واقف بھی تھا اس نے ہندوستان کے ہر علاقہ اوران کی تہذیب وثقافت کے ساتھ علم وادب میں ہوئے گراں قدر کارناموں کو بھی تحریری شکل دیکر منظر عام پر لایا اس کی شخصیت بہت ہی ہمہ گیر و ہمہ جہت تھی اس نے ویدانتوں اور ہندوموحدین کے خیالات کو محنت سے فارسی میں منتقل کیا،جوگ وشسٹ اور اپنشدوں کا بھی ترجمہ کیا اس کی تحریریں انتہائی مستند غیر جانب دارانہ اور حقیقت پر مبنی ہیں۔

چندر بھان برہمن نے اپنی نثری تخلیقات میں بھی تصوف کے رموز ونکات پر بحث کی ہے اور اپنے قارئین کو در ہائے تصوف سے روشناس کرایا ہے خدا کے وجود اور خلقت کی بناء پر روشنی ڈالی ہے،چونکہ یہ دنیا خدا کی خلقت ہے یہاں کی ہر ایک چیز اسی کی بنائی ہوئی ہے اسنے انسان کو پیدا کیا اسے مختلف علوم وفنون سے آراستہ وپیراستہ کیا اسکے سبزہ وگل تعمیر کئے اسنے انسان میں جسمانی اور روحانی طاقت بھی داخل کی اور روحانی طاقت جب جسم اور دنیاوی مساوات پر غلبہ پالیتی ہے تو فرشتہ صفت بن جاتا ہے اور اگر ذرا سی لغزش ہو جائے تو اس دنیا کے اندھیرے میں گم بھی ہو جاتا ہے برہمن نے ان خیالات کا اظہار چہار چمن کے چمن آخر میں اس طرح کیا ہے:

"اولین بنای که دست قدرت قادر مطلق در خانه تکوین و ایجاد گزاشت و بهترین صنعتی که صانع بر حق بر فراز بیداری آورد، خلقت انسان است که به چندین شیون و فنون آراسته و پیراسته و با نواع جلی و حلی مزین و مرتبت گشته آنچه از اصول و فروغ و محصول مزروع بر سطح ارض و سما محسوس و مشهود است غذای روحانی و جسمانی و اسباب مفتح و کامرانی اوست۔ استعدادا انوار روحانی برو فایق گردد که بمراتب فلکی فائز شود۔ و اگر از رف شقاوت ذاتی در ظلمت آباد نادانی خرد رود به بهائم متشابه باشد۔ رباعی:

آدمی زاده طرفه معجون است　　از فرشته سرشت در حیوان
گر کند میل ایں شود کم ازیں　　در کند میل آں شود به ازاں

نفس کی طاقت مسلم ہے وہ آفتاب کی طرح قائم اور روشن ہے اور موتی کی طرح چمکدار ہے،انسان کو اپنی سمجھ بوجھ کے ذریعہ نفس کا پتہ لگانا چاہئے تاکہ اسکی آنکھوں اور دل کی صفائی ہو جائے،بہترین علم سے آراستہ وپیراستہ عالموں صوفیوں اور استاذوں نے اپنے علم وہنر کے

ذریعہ دقیق سے دقیق باتوں کا پتہ لگایا ہے اور اس تحقیق کو انہوں نے اپنی تصنیفوں، تاریخوں اور رسائل میں یکجا کر دیا تا کہ آنے والے زمانہ میں عام آدمی اسکی سچائی کو جان سکیں برہمن نے اس بات کو اس انداز میں پیش کیا ہے:

''اما نفس ز آفتاب حقیقت پایاں و گوہر معرفت درخشاں است دیدہ بینا، دل دانا، بجہت دید و دریافت آں مطلوب کوشش کن کہ دیدہ را ضیاے و دل را صفائے حاصل شود۔ از آغاز آفرینش عارفان و عاشقاں و کاملاں و اصلاں و مقبولاں و دانایاں و پیشوایان ہر قوم و استادان ہر سلسلہ مطابق قانون و قاعدہ و رسم وروش و طرز و طریق خود آنچہ لازمہ تحقیق و دریافت اصل کار بودہ بدستیاری خرد حقیقہ اساس در ہمنموئی عقل حق شناس مخفی و مستور نماندہ و از دقائق وحقایق دقیقہ و لطیفہ از خرد دور بیں و فہم صواب گزیں شاں فرو گذاشت نشدہ و از مشرب و مذہب ایں گروہ والا شکوہ کتب و تواریخ و نسخہا و دفتر ہا مملو از ما کہ دوربین و خرد صواب گزیں و گوش حقیقت نیوش۔ بخشیدند باتباع و سماع اقوال و افعال ایں طبقہ صافی نہاد پے بمطلب برد و سر از مقصود بر آوردہ و خود را در معرض گفتگو آوردن اگر چہ کہ در آغاز حال کہ ہنگام جوش و خروش دریای طلب است اما بعد از شناخت حال مہر سکوت بر لب گذاشتن اولی است۔ رباعی۔

آنانکہ ز عشق و رنگ بوی دارند   از آب دویدہ آبروئی دارند
چوں غنچہ بصد زباں خموشند ولی   در پردہ بخویش گفتگوی دارند

چندر بھان برہمن آگہی کے بارے میں اپنے خیال ظاہر کرتا ہے کہ یہ جو تیری عمر ہے یہ تمیز اور عقل سے کام لینے کی عمر ہے نہ کہ غفلت میں بس گزارنے کی اور انسان سے جو بھی غلطیاں ہوئیں ہیں انہیں اسکی تلافی کر لینی چاہئے کیونکہ گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتا اور جو وقت گزر جائے گا اس کی آئیندہ تلافی نہ ہو پائے گی اسلئے بہتر ہے کہ آج کا کام آج ہی کر لیا ہے اس سلسلہ میں برہمن یوں رقم طراز ہے:۔

''ائے عزیز وقت تمیز و ہنگام امتیاز است، نہ محل تغافل و اغماض عمری کہ بی طالب گذشت تلافی آں بکوش اگر چہ نقد عمر گرانی را عوضی و بدلے نباشد و تلافی گذشتہ در آئندہ متصور نہ،لیکن غرض از تاکید آنست کہ آئندہ چوں گذشتہ مگذار قول بزرگاں راہ راست کہ امروز ہماں یہ کہ فردا ابکار آید کہ امروز بعمل آید ۔قطعہ۔

آنانکه بفردا نظری داشته اند امروز هر انچه کشتے کاشته اند
چوں خاك فتاده اند در راه نیاز در دیدۂ حرص خاك انباشته اند

یہ دنیا حادثوں کی دنیا ہے یہاں سوائے توکل کے اور راستۂ نجات نہیں، جب انسان خلوص اختیار کرتا ہے تو اس کے لئے جنت کا راستہ آسان ہو جاتا ہے، ایسے اشخاص کے دل میں سکون، آنکھوں میں محبت خلق اور تسلیم ورضا ہوتی ہے، صاحبان توکل ہی اس دنیا کو صحیح راستہ دکھانے والے ہیں برہمن کا نظریہ ملاحظہ فرمائیں:

" از تاب آفتاب حوادث روزگار غیر از سایه دیوار توکل نتواں رست چوں گوشه توکل نصیب رہروان وادئ اخلاص گردد، سر بسایه طوبیٰ فرو و نظر بر شاخ و برگ باغ جناں بیند ازو تدبر رہمتوں خاطر خطیر شان، غبار کوی تعلق راه نتواند گشت سیر چشماں مایده رضا و تسلیم محبت جگر و آب دیده شگفته جبیں و چہره تازه باشند و بقطره آبی آبروئے خود را نریزند خاك کوچه قناعت صندل جبیں ارباب توکل است۔ ابیات:۔

مرد چوں در راه توکل شود خار مغیلاں برہش گل شود
خار گل اندر نظر برہرواں میدہد از گلشن معنی نشاں

برہمن گناہ اور ثواب کے بارے میں مطالعۂ محاسبہ لکھتا ہے:

"چوں بار جرم و گناه بر دوش دل گرانی گرفت و مغلوب استیلای طبیعت گشتم یکی از گرد حال خود گردیدم۔ لختی از خود رفتم و باز بخود آمدم حیران تضیع اوقات خود گشتم و بر کرد کار خود نادم شدم و بتاسف تحیر در ماندم خواستم که اشکے چند که طوفانی از دیده فرد ریزم و ماتم ایام گزشته بدارم و بتدارك آں بکوشم و نوحه کناں بدر یوزه از باب حال روم شاید داد خود انجا یابم و بمطلب خود از اں لاودسم دریں مطارحه در عالم دیگر افتادم آنچه از دیگری جستم در خود یافتم ہمیں فساد نقس بود که سد راه مطلب میشد چوں ترك مقاصد جسمانی کردم راه بعالم روحانی بردم تن را خکستر آتش ساختم۔ آئینه خاطر را جلای دیگر دادم، چوں سر بگریباں بردم عالمی یافتم دیگر جہانی دیدم از جہاں بر ترکاری دیوانه دار رو بصحرا شتافتم گاہی دانا مثال خود را در کنج خلوت انداختم ازیں شادی بخود این

قدر نالیدم که دلم از ہوش رفت و ہوش از دل در گلشن ندامت بمنزل مقصود ندیدم بخون نابه جگر را در پرده دل نتیجه صافی تر از بادۂ ناب ساختم لخت جگر را کباب نمودم ماحضری بجہته نفس آوردم و بدستیاری توفیق از طریق خطا، صرب صواب آوردم و بعزم درست نائب اعمال ناشائسته گشتم مجادله با نفس ایں دولت یمن ارزانی داشت اگر سرکشی کند گو شمالش دہم ہمیں الفت طبیعت است که بہوا جنس نفسائی فریفته دارد یه آب و رنگ ظاہر فروغ بسیمای حال نباید داد۔ بجنس و خاشاك غفلت چشمه صافی دلاں را نشاید انباشت۔ رباعی:۔

چشمۂ دل منبع فیض خداست زنده دل آنکس که بدل آشناست

بادل خود محرم و پیوسته باش راست بہم صاف چوں آئنه است

توبہ خدا کے قریب ہونے کا راستہ بھی نہ کہ صرف گناہوں سے معافی۔ کیونکہ اگر کسی انسان نے یہ سمجھ لیا کہ اس نے کوئی غلط کام ایسا کیا ہے جو اس کے خالق کی نظر میں بھی غلط ہے تو اس کا خالق بھی اپنے اس نادان بندے کی طرف رجوع ہوتا توبہ کے مراتب اور اس پر استقامت کے بارے میں برہمن لکھتا ہے کہ:۔

اگر چه در معالجه امراض نفسانی ارباب علم و عمل نسخہا نوشته اند اما آنچه بانتخاب رسیده اینست که ایں مریض را از چیزہای که باعث مضرمت اوست مبرہمن باید نمود و در مقام اصلاح مہمات باید در آید۔ اگر دریں باب مسائله روزگار بفساد انجامد و آج مرض از علاج افتد کلیه دریں راه حاضر بودن است بر اوقات خویشتن و دریافتن معامله حال خویش که چوں کسی شناسای خود شود و خود را فاسد داند ناچار در مقام اصلاح در آیدو به تدریج از بیماری نفس اماره بر آید۔ ابیات:۔

دشمن تست نفس سرکش تو در کمینگاه کرده کاہش تو

تا تو آموز کار خود نشوی قابل روزگار خود نشوی

کچھ لوگ اس دنیا میں تعلقات کی بناء پر پھنسے ہوئے ہیں اور اسی کو اپنی زندگی سمجھتے ہیں یہ بھی نہیں سمجھتے کہ انہیں کس لئے پیدا کیا گیا ہے اور انکا وجود ان سے کیا مانگتا ہے۔ خدا نے اسکی ہستی سے کیا کام لینے چاہے ہیں اور وہ کن مشغولیات میں دفن ہے برہمن زندگی کے اس فلسفہ کے بارے میں رقم طراز ہے:۔

"جمعی کہ در دام تعلق گرفتار اند بامید داد نہ ہوس کشت زار جود را با دیدہ خون جگر سر سبز داشتہ در آخر کار بجز تاسف و تحیر نمی نمایند و غافل از درس جانکاہ غفلت و ایمن از شغل دہقان روزگار کہ ہر لحظہ از خوشہ عمر دانہ دانہ جدا کند و ہر روز خرمن ہستی بباد دہد۔ ایں نقد بعوض و بدل عمر گرامی است کہ رایگان صرف میشود۔ حیران ایں شغل روزگارم کہ عمر لحظہ کمتر میگردد و شغل ہر لمحہ بیشتر تا چند ازیں و آں سخن گفتن نباید گفت و کار باید ساخت۔ اول نقش اندیشہ غیر از صفحہ خاطر ز ایل باید ساخت و پیشگاہ خاطر را کہ بجنس و خاشاک غفلت انباشتہ شدہ وقت در دل دادہ ایں گلزار ہمیشہ بہار معانی را بآب دیدہ خون جگر شاداب باید داشت۔ دل آئینہ است نورانی و صور معانی درو جلوہ گر بصیقل تجرد از زیر رنگ حوادث تعلق باید بر آورد تا منقش بنقوش سعادت دارین گردد۔ بیت:۔

بزیر رنگ تعلق سیاہ نتواں داشت   کہ دل چو آئینہ ز آفتاب نور اینست

اس دنیا میں آئین اور قانون خداوندی کے ساتھ جینے یا زندگی بسر کرنے کے لئے علم کا پاس ہونا بیحد ضروری ہے یہ دنیا دکھاوے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے یہاں اگر آپ لاعلمی کی نظر سے دیکھیں تو آپ بے شمار رنگ نظر آئیں گے جو اتنے شوخ ہوں گے کہ اپنی اپنی طرف آپ کا دھیان کھینچنے کی کوشش کریں گے لیکن برعکس اس کے اگر آپ کو علم کی دولت ملی ہوئی تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سارے رنگ بیکار ہیں صرف ایک ہی ہستی ہے باقی سب نیستی ہیں صرف خدائے واحد ہی کی کثرت نظر آتی ہے اور یہی علم وحدت الوجود اور وحدت فی الکثرت کا جلوہ نما ہے برہمن اس بارے میں رقم طراز ہے کہ:۔

"مشتاقان در پردہ تماشای صور معانی کنند و در حجاب بے حجابانہ دست در آغوش شاہد مقصود نمایند بیت:۔

کند ز پردہ تماشای کار خانہ چمن   اگر کسی بحجاب تو آشنا باشد

چوں قرب معانی در عالم یکرنگی و یگانگی منظور است بعد مسافت صوری حجاب ایں پیشگاہ سدراہ میگردد چہ جلوہ صورت نمودی بیش نیست و شاہد معنی بہ کسوت بقای جاودانی آراستہ حجاب اکسیر ہمیں ہستی موہوم است و نفی آں عین آگاہی ۔ بیت:۔

بعشق و حسن بود نسبتے که نتوان گفت همیں حجاب بلا گشت درمیانه ما

در دیوار ارباب محبت آئینه دار است و صور وفا و نقوش اخلاص در آں پرتو انـد از اول شرط رہروان ایں طریق گم کردن نقش ہستی خویش است تا نقش ہستی موہوم ہر جاست فساد نفس برپاست چوں ایں نقش محو شود آثار بقای مطلق بظہور آید ہمیں مارمنی است که پردۂ غفلت بر چہرۂ دانش انداخته و دیده بینش را بخاك ندامت انباشته یکی دست و پای ہمت بجنبش در آر و ود را در گرداب تحیر فرو مگذار بر سر ایں معنی از راه شورت و قوف نتواں یافت تا غیار تعلق از حواشی باطن محو نشود پی مطلب خاص نتواں رفت ناحجاب صورت بر نخیزد چشم بر چہرۂ معانی نتواں دوخت۔ اگر چه صورت را با معنی رازہاست لیکن چوں اسرار معنی حاصل شود، توسط و توسل صوری از میاں برخیزد و شاہد معنی جلوه گر گردد و چشمی که نظاره گر صورت معنی شود معنی صورت را در باید ہر گز نگاه بعالم صورت نکند نظارگیان حسن روز افزوں جمال مطلق بحسن زود زوال عالم فانی نفر بیند رہروان وادی تحیر دست ہمت از کونین افشانده در گذشته اند دوبستگاں عالم صورت در مضیق حیرت فرومانده۔ بیت:۔

کرد از بحر خطر مرد سبکسار عبور بر سر راه فرو مانده گر انباری چند

علم اور عقل میں یکسانیت ہونی چاہئے عقل کو اتنی قوت ہونی چاہئے کہ وہ یہ سمجھ سکے کہ وقت کا تعین کس اعتبار سے کیا جائے جائے کیونکہ گزرا ہوا وقت واپس ہاتھ نہیں آتا اور چونکہ اس عمر گرامی کا کچھ پتہ نہیں کہ کب اسکی شام ڈھل جائے اسلئے جتنا زیادہ وقت صحیح کاموں میں صرف ہو جائے وہ بہتر ہے برہمن کا نظریہ ہے کہ:۔

”علم عقل دوراندیش آنست که پیوسته نظر بر اصل کار و کیف در حال داشته خلاصه اوقات را مصروف به تحصیل کسب کمال باید نمود عمر را عزیز داشته تضیع اوقات را و بال عظیم باید دانست ہر نعمتی که ہست در پاس مراتب وقت است۔ بیت:۔

غفلت ز احتیات نفس یك نفس مکن شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود

عقل دانا کے بارے میں ایک جگہ اور رقم طراز ہے:۔

''چون دل دانا و چشم بینا و تن توانا و گوش شنوا نصیب شود و در تماشای جلوہ صبح و پرتو شام مشاہدہ آفتاب و نظارہ ماہ سر عجز و نیاز بخاک عبودیت و بندگی باید سود و خاک راہ ادب را توتیای دیدہ اخلاص باید نمود۔''

برہمن کی علم شناسی اور علم دوستی کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں کہ وہ کہتا ہے وہ لوگ جو حقیقت پر نظر رکھتے ہیں اچھے ہیں انسے جو حقیقت کو درگزر کرتے ہیں اس دنیا میں کچھ نہیں اور حق ہی حقیقت ہے مگر ایسا علم جو دنیاوی لگاؤ پیدا کرے اسمیں مزہ پیدا کرے بیکار ہے:۔

''خوشا رہروان طریق معنی کہ در عالم صورت را صفر محض دانستہ روی توجہ از قبول آں گردانیدہ دل را سوی مطلب آوردہ اند۔ مطلب طالب غیر از طلب مطلوب نیست چوں طلب خاص بہم رسد ہر آئینہ طالب بمطلوب رسد و چوں خودی و خود پرستی از میاں بر خیزد طالب عین مطلوب گردد۔ مطالب جمیع طالباں را ہمیں است پس اللہ تعالیٰ رہروان وادی و پی سیران ایں طریق را بہ بدرقہ کرم عمیم خود بمنزل مقصود درساند۔''

برہمن عہد مغلیہ کی ایک ہمہ جہت شخصیت تھی جس کی تمام تصانیف عظمت آدم اور خدمت آدمیت کا درس دے رہی ہیں اتفاق، اتحاد ،یکجہتی، صلح کل، سخاوت، وفا شعاری، خودداری، دلداری، اور انسان دوستی کے لئے اس کی تحریریں ایک صحیفہ کی حیثیت رکھتی ہیں جہاں وہدانت کا فلسفہ بھی ہے اپنشد کا پیغام بھی ہے گیتا کے اپدیش بھی ہیں اور اسلامی فلسفہ کا عکس بھی ہے، وہ دل آزاری سے گریزاں اور دل داری کے لئے کوشاں بھی تھا جغرافیہ کے علم تاریخ کے تقدس، صحیفہ کی حرمت، ریاضی کی مہارت، اور انشاءِ فن میں قادر کے ساتھ ساتھ تصوف کے رموز ونکات سے واقف بھی تھا، وحدت الوجود اور ہمہ اوست پر اسے کامل یقین تھا اور یہی اس کا ایمان تھا، جہاں آزادی کا مطلب عبادت اور خدمت خلق تھا، غرض کہ اس کی تمام تصانیف میں حکایت بالنفس، تازیانۂ آگاہی، دریافت اصل حقیقت، لذت ترک تعلق، استقامت بر توکل، بے ثباتی اساس روزگار، اور فکر آخرت اور قربت قدرت کا پیغام پوشیدہ وہ اس جہان فانی، کو جہان جاودانی کی کھیتی، تصور کرتا ہے اسلئے ایک پل بھی اس دنیا میں وہ بیکار نہیں رہنا چاہتا ہے، بلکہ ہر لمحہ کو وہ آخرت اور عاقبت پر قربان کر کے خود کو کامیابی و کامرانی سے قریب تر کرنا چاہتا ہے، اسلئے اس نے اپنے آپ کو تمام علوم وفنون سے سے آراستہ بھی کیا اور زیست کے میدان کارزار میں ہر ایک کا بھر پور استعمال کر کے آدمیت کو انسانیت کا پیغام دیتا رہا اسکی تصانیف علم کا خزانہ بھی ہیں اور اصلاح وفلاح کا زینہ بھی جہاں نہ علاقائیت نہ عصبیت بلکہ صرف اور صرف درس بلندگی اور پیغام پاکیزگی ہے، اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ چہار چمن ایک عبرت کا پیغام بھی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر مبشرہ صدف
اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبہ اردو، ایم۔ڈی۔ڈی۔ڈی۔کالج، بی۔آر۔اے۔بہار یونیورسٹی، مظفرپور، بہار

سید احتشام حسین کی تنقید میں سماجی حقیقت نگاری اور فکری جہتیں

سید احتشام حسین کا شمار اردو کے ان ناقدوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ترقی پسند تنقید کو صحت مند نظریے سے روشناس کرایا اور اردو تنقید کو وسعت اور ہمہ گیری عطا کی۔احتشام حسین بنیادی طور پر ایک سچے ترقی پسند ناقد تھے۔انہوں نے ادب کو ہمیشہ اشترا کی اور سماجی نقطہ نظر سے دیکھا۔ان کے نزدیک ادب کا سب سے بڑا مقصد سماج کی خدمت، انسانی مسائل کی درست ترجمانی اور طبقاتی تضادات کو سمجھنا ہے۔سماجی حقیقت نگاری کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ ادب وہی معتبر ہے جو سماج کے المیوں، محرومیوں، ناانصافیوں، اور طبقاتی کشمکش کو اجاگر کرے۔احتشام حسین کی پیدائش 1912ء ماہل ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی ان کے والد کا نام سید ابوجعفر رضوی تھا۔ابتدائی تعلیم گورکھپور میں ہوئی۔دہلی ہائی اسکول اعظم گڑھ سے ہائی اسکول پاس کیا اور مزید تعلیم کے لیے الہ آباد آ گئے۔کرسچن کالج الہ آباد سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا اور الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے اور پھر ایم۔اے اردو 1936ء میں کیا۔اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو فارسی کے شعبے میں اردو کے لکچرر ہو گئے۔1952ء میں امریکہ کی ادبی انجمن نے لکچر شپ کے لیے بلایا۔انہوں نے امریکہ کے علاوہ یورپ اور فرانس کا سفر بھی کیا۔1961ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے۔1972ء میں الہ آباد میں انتقال ہو گیا۔

احتشام حسین کی تنقید کے متعدد مجموعے ہیں۔تنقید کے علاوہ ترتیب پر بھی ان کے بہت سی کتابیں ہیں۔تنقیدی کتابوں میں (1) تنقیدی جائزے (1944) (2) روایت سے بغاوت (1947) (3) ادب اور سماج (1948) (4) تنقید اور عملی تنقید (1952) (5) ذوق ادب اور شعور (1955) (6) عکس اور آئینے (1961) (7) افکار و مسائل (1963) (8) اعتبار نظر (1965) (9) اردو لسانیات کا خاکہ (1948) (10) ساحل اور سمندر (سفر نامہ) (11) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (1983) (12) جدید ادب۔منظر اور پس منظر (13) جوش ملیح آبادی۔انسان اور شاعر وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔بحیثیت مرتب ان کی کتابیں، (1) تنقیدی نظریات جلد اول (1955) (2) تنقیدی نظریات جلد دوم (1966) (3) آب حیات (1972) (4) انتخاب جوش (1971) (5) کلاسیکی یا تہذیب کا مستقبل (1961) وغیرہ قابل ذکر ہے۔ترقی پسند تنقید پر ان کے تنقیدی مضامین نے بہت زیادہ اثر ڈالا۔دراصل ان کے خالص ترقی پسند تنقیدی نظریے ان مضامین کے ذریعہ اردو ادب میں پہنچے۔ترقی پسند تنقید کے تعلق سے جو مضامین انھوں نے لکھے وہ یہ ہیں۔(1) ادب کا ماڈی تصور (2) اردو ادب میں ترقی پسندی کی روایت (3) اصول تنقید (4) تنقید نظریہ اور عمل (5) ادبی تنقید قدر و معیار کا مسئلہ (6) نیا ادب اور ترقی پسند ادب (7) ماضی کا ادب اور نئے تنقیدی ردّعمل (8) تخلیقی قدریں اور عصری ادب۔یہ مضامین ان کے نظریاتی تنقید کو پیش کرتے

ہیں اس کے علاوہ انھوں نے عملی تنقید کے تعلق سے بے شمار مضامین لکھے۔

احتشام حسین سچے ترقی پسند نقاد ہیں انھوں نے اردو ادب کو ہمیشہ اشترا کی نظریہ سے دیکھا اور ادب میں سماج کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ وہ ترقی پسند تنقید کے علمبر دار ہیں۔ نظریاتی طور پر ادب برائے ادب کے نظریے کو نہ مان کر ادب برائے سماج کے اشترا کی نظریے کے قائل ہیں۔ مارکسی فلسفہ اور سائنسی فکر کے اشتراک سے ان کی تنقید وجود میں آتی ہے۔ ان کے تنقیدی نظریے نے اردو تنقید کو جدید خیالات اور فکر و آگہی کے نئے رنگ عطا کیے۔ انھوں نے ادب اور سماج کے اندرونی اور بیرونی رشتے کو سمجھا اور اسے اپنی تنقید کے ذریعہ اردو ادب تک پہنچایا۔ ترقی پسند تحریک کے وہ پہلے ناقد ہیں جنھوں نے مکمل طور پر ناقد ہونے کا فرض ادا کیا اور مارکسی فلسفہ اور اشترا کی خیالات اور افکار کو متوازن صورت میں اعتدال کے ساتھ منطقی انداز میں پیش کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ترقی پسند نظریے میں مادی افکار و خیالات کو اہمیت دی جاتی ہے ۔لیکن بہت سے ترقی پسند ناقدوں نے انہیں افکار و خیالات کو ادب اور تنقید میں انتہا پسندی کے ساتھ پیش کیا تو ترقی پسند تنقید محض اشترا کی خیالات و نظریات کی مبلغ بن گئی۔ احتشام حسین نے اس شدت پسندی کو دور کر کے ترقی پسند تنقید کو سائنٹفک تنقید کی صورت میں پیش کیا۔ ان کی تنقید کی انہی خوبیوں کے متعلق قمر رئیس اپنے مضمون ''سید احتشام حسین اور عصری تنقید کے مسائل'' میں اس طرح رقم طراز ہیں:۔

> **''..... ذاتی تعصّبات، تنگ نظری اور ادایت سے بلند ہو کر انھوں نے ادبی حقائق کو مادّی حقائق اور تہذیب کے وسیع تر پس منظر میں دیکھا اور سمجھا۔ انھوں نے کبھی اس پر اصرار نہیں کیا کہ ادبی تنقید کے دوسرے طریقہ کار سچائی سے عاری ہیں، لیکن انھوں نے اس پر اصرار ضرور کیا کہ فن اور ادب کو جانچنے کے لیے ایسے خارجی اصولوں یا معیاروں کی تلاش نقاد کا سب سے بڑا فریضہ ہے جو ادبی صداقتوں تک پہنچا سکے جو تنقید کو دوسرے سماجی علوم کی سطح تک لا سکیں۔''**
>
> (سید احتشام حسین اور عصری تنقید کے مسائل۔تنقیدی تناظر۔از قمر رئیس، صفحہ۔49-48)

احتشام حسین نے ادب اور سماج کے تعلق کو نہایت گہرائی سے سمجھا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ادب اپنے ماحول سے کٹ کر وجود میں نہیں آتا۔ ایک ادیب کا شعور، اس کے تجربات، زمانے کے تضادات اور معاشرتی ارتقا مل کر ادبی تخلیق کو جنم دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب نہ خالص جمالیاتی تجربہ ہے نہ ہی محض سیاسی نظریہ بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے جو زندگی کی تہوں سے پھوٹتی ہے۔ احتشام حسین سماجی تنقید کو پیش کرتے ہیں اور ادب کے سماجی پس منظر کو تنقید کا لازمی حصہ مانتے ہیں۔ لیکن یہ وہ سماجی تنقید نہیں ہے جو اس سے قبل اردو تنقید میں دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ یہ سماجی تنقید دراصل مارکسی اور اشترا کی ہے اور یہ مارکسی فلسفہ کی پیداوار ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے صرف اشترا کی فلسفے، مارکسی نظریہ ادب اور طبقاتی نظام کے تحت ہی ادب کو دیکھا۔ لیکن تنقید میں سماج کو اولیت دی کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ ادب کبھی خلا میں پیدا نہیں ہوتا اس کی جڑیں ہمیشہ زمین میں پیوست رہتی ہے۔ ہر ادیب اور قلم کار ایک سماجی کارکن ہے اور اسے سماجی بنیاد پر تخلیق کرنی چاہیے اور ایک ناقد کا کام ان ادبی اور فنی کارناموں کا جائزہ لینا ہے۔ یہ تنقیدی جائزہ جدلیاتی مادیت کے دائرے میں ہونا چاہیے تبھی تنقید صحیح اور مکمل ہوگی۔ اپنے مضمون ''تنقید قدر اور معیار کا مسئلہ'' میں وہ ناقد کی سماجی ذمہ داریوں کے بارے میں کہتے ہیں:۔

''......ادبی تنقید ایک فلسفیانہ مشغلہ ہے جس میں فکر وفن کے متعلق پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس سلسلے میں جن دوسرے علوم سے مدد مل سکتی ہے، نقاد ان سے کام لیتا ہے۔...... نقاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس نئے پن کو انفرادی اور اجتماعی ،نفسیاتی اور تاریخی حقائق کی روشنی میں دیکھے تاکہ فن کار کے شعور کی تمام تہوں اور اس کی تخلیق کی تمام پیچیدگیوں کا جائزہ لینے کے بعد اس کے مقام اور قدر کا تعین کیا جا سکے۔اسے سماجی حقیقت پسندی کا نقطۂ نظر کہہ سکتے ہیں کیوں کہ یہ ضرور سماج،فرد کے سماجی شعور،ادبی روایت کی ابتدا اور ارتقا،ذوق و ادب کی بدلتی ہوئی نوعیت،قومی شعور کسی حقیقت کو جو ادیب یا اس کے تخلیق پر اثر انداز ہو سکتی ہے،نظرانداز نہیں کرتا۔''

(تنقیدی نظریات جلد دوم۔احتشام حسین،صفحہ۔309-310)

اردو ادب اور تنقید میں مارکسی نقطۂ نظر کی تشکیل میں سید احتشام حسین کا نام اہم ہے۔اگر اردو تنقید میں مارکس کے اشتراکی نظریے سائنٹفک تنقید کی اہمیت کو سمجھنا ہے تو احتشام حسین کے نظریات اور خیالات سے واقف ہونا بے حد ضروری ہے۔ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تنقید میں سماج، تاریخ اور اشتراکیت کو کس حد تک اولیت دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے ایک مارکسی نقاد ہونے کا حق ادا کیا۔ان کی تنقید کا ایک مخصوص مسلک ہے اور یہ مسلک ترقی پسند اور مارکسی ہے۔انھوں نے اردو ادب کے قدیم اور جدید سرمائے کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھا اور قدر و قیمت متعین کی۔ترقی پسند نظریہ کی وضاحت اور اپنے موقف کو پیش کرنے کے لیے احتشام حسین نے جن منطقی اور استدلالی وجوہات کو بیان کیا وہ قابل ذکر ہے۔اپنے مضمون ''ادب کا مادی تصور'' میں اسی نقطۂ کو پیش کرتے ہیں:۔

''فن کار کو حقیقت کا ادراک اس طرح کرنا چاہیے کہ حقیقت اپنی ارتقائی اور انقلابی شکل میں تمام تاریخی اور مادّی پہلوؤں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس کے فن میں منتقل ہو۔اس کی یہ کاوش انفعالی نہیں ہو سکتی بلکہ لامحالہ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ عوام کے شعور میں اس کے فن کے مطالعے سے تغیر پیدا ہو جو اشتراکیت کی سچائی خوبی اور برتری کے تصورات کو راسخ کرے۔یہی ادب کا مادّی تصور ہے جو فن کے تنوع کا مخالف نہیں ہے۔جدت برائے جدت اور ہیئت پرستی کا مخالف ہے، جو ادب کے کھوکھلے پن بے اثری میکانیکی اور بے رنگ حقیقت نگاری اور بے مقصدی کا مخالف ہے یہی ادب کو جاندار،خوبصورت اور انسان دوست بنانے کا تصور ہے۔''

(ادب کا مادّی تصور۔احتشام حسین،ترقی پسندی جدیدیت،مابعد جدیدیت،ڈاکٹر ندیم احمد،صفحہ۔126-127)

اشتراکیت اور سماجی تنقید کے متعلق احتشام حسین کی کتاب تنقیدی جائزے اہم ہیں۔اس میں شامل مضامین 'شاعری کے نقاد'، 'ادب اور اخلاق'، 'نئے ادبی رجحانات'، 'قدیم ادب اور ترقی پسند نقاد' اور 'ہیئت کا مسئلہ' اہم ہیں۔اس میں انھوں نے تنقید کا سائنٹفک رجحان اپنایا ہے جو ترقی پسند نظریے کی انتہا پسندی سے دور ہے۔اصول و نظریے میں ادب اور فن کی اہمیت برقرار رکھتے ہوئے تاریخ،سماج اور تہذیب کے حوالے اس کا جائزہ لیا ہے۔''روایت اور بغاوت'' میں خیال، مادہ اور شعور پر فلسفیانہ بحث کی ہے ساتھ میں قدیم ادب کی اہمیت اور

افادیت کو ترقی پسند نظریے کے تحت دیکھا ہے۔''ادب اور شعور'' بھی ان کے اشتراکی نظریے کی وضاحت کرتے ہیں۔اس میں انھوں نے کارل مارکس کے طبقاتی نظام کے حوالے سے ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ادیب اور ذہنی ازادی کے متعلق بھی انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔اس طرح ''جدید ادب منظر اور پس منظر'' ان کی اہم کتاب ہے جس میں انھوں نے ترقی پسند ادب کے علاوہ کلاسکی ادب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔احتشام حسین کی تنقید کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تنقید کو ہمیشہ تاریخ کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔مارکسی فلسفہ اور جدلیاتی مادیت کو جب ادب میں پیش کرتے ہیں تو اس کا سبب وہ تاریخ سے تلاش کرتے ہیں۔جس نے ان کی تنقید میں جدت پسندی کے عناصر واضح ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی تنقید کے ذریعہ مارکسی فلسفہ براہ راست نہ ہوکر بالواسطہ اردو تنقید میں داخل ہوا۔ادب کو تاریخی اور سماجی پس منظر میں دیکھنے کے سبب پروفیسر سید محمد عقیل رضوی اپنے مضمون ''سید احتشام حسین کی تنقید نگاری میں'' میں لکھتے ہیں:۔

> **''......انھوں نے حرکی سماجی صورتوں کو خاص طور پر اپنایا ہے جس میں تاریخیت کی ہر جگہ رنگ آمیزی ملتی ہے۔کیوں کہ تاریخ کے پیچ وخم کا اندازہ کیے بغیر سماجی اور کسی حد تک معاشرتی تغیر کے اسباب بھی تلاش نہیں کیے جا سکتے ،خاص طور پر وہ پیچ وخم جو عملی طور پر انسانوں کی سماجی تعلقات،سماجی ،فکری اور معاشی سے تبدیلیوں کو تلاش کرتے ہیں۔''**
>
> (اردو تنقید مسائل ومباحث۔مرتب پروفیسر منظر عباس نقوی،صفحہ۔196)

احتشام حسین کی تنقید اور مغربی ناقدوں کے خیالات میں بعض مماثلتیں ہیں۔وہاب اشرفی اپنی تاریخ ادب اردو میں اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ان کے خیال میں اگر ترقی پسند تنقید کو عالمی تحریک کے طور پر دیکھا جائے تو مغربی ناقد Vladmir Pereverzev اور احتشام حسین کا نظریہ بہت ملتا ہے۔دونوں ناقدوں نے شعر وادب کی تخلیق میں سماجی احوال کو زیر نگاہ رکھا ہے۔اور تمام ادبی قدروں کو مادی بنیادوں پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔روس کے ناقد Andri Gadomov اور George Melenkov اٹلی کے ناقد Antonio Godomov اور امریکہ کے نقاد F.V.Calvarton اور Granvellelicks کے تنقیدی نظریات احتشام حسین کے تنقیدی خیالات سے ملتے جلتے ہیں۔

احتشام حسین کا تنقیدی نظریہ دراصل سائنٹفک ہے۔انھوں نے مارکسی خیالات کا اظہار جمالیاتی قدروں کے ساتھ کیا جس سے ان کی تنقید میں سائنٹفک رجحان پیدا ہوا۔نظریاتی تنقید میں ان کے فکر وخیالات نے پہلی بار ترقی پسند تنقید کو وقار عطا کیا۔ایسا نہیں کہ وہ عملی تنقید سے دور ہیں۔عملی تنقید پر ان کے بہت سے اہم کام کیے ہیں جس میں انھوں نے ادب کو مارکسی نظریے اور سائنٹفک اصولوں کے تحت پرکھا۔ان کا تنقیدی رویہ سلجھا اور آسان ہے وہ تنقید میں فکر وفن دونوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ادب کی تاریخی اہمیت کو انھوں نے سمجھا اور اسے اپنی تنقید کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ادب اور تنقید کے متعلق ان کے خیالات مارکسی ناقدوں سے مختلف نہیں ہے کہ ادب اجتماعی اور سماجی ہوتا ہے۔سماج کے تغیر اور تاریخی عمل سے ادب وجود میں آتا ہے۔احتشام حسین کی تنقید کی ایک خوبی یہ ہے کہ انھوں نے نظریاتی اور عملی تنقید میں کوئی امتیاز نہیں رکھا۔انھوں نے نظریاتی طور پر تنقید میں جو اصول وقواعد مقرر کیے اسے ہی اپنی عملی تنقید کے ذریعہ پیش کیا۔خالص ترقی پسند نظریہ جسے انھوں نے

ادبی تنقید میں پیش کیا اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تنقیدی نظریہ مارکسزم کے اصول وضوابط کو مانتا ہے لیکن ادب کے فنی اور جمالیاتی اقدار سے دور نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے تنقید میں ہمیشہ توازن واعتدال نظر آتا ہے۔ اس بارے میں شارب رودلوی کہتے ہیں:۔

> **''پرفیسر احتشام حسین اردو تنقید میں ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں انھوں نے ترقی پسند رجحانات کے تحت نظریاتی تنقید کے اصولوں کو مرتب کرنے کی کوشش کی اور قدامت پرستی اور انتہا پسندی، ادب اور سماج اور جدلیاتی مادیت کے مباحث میں ترقی پسند تنقید اور ادب کو واضح بنیادوں پر پیش کر کے سائنٹفک تنقید کی بنیاد ڈالی۔ وہ ادب وزندگی پر تاریخی تبدیلیوں اور سیاسی شکست وریخت کے اثرات پر گہری نگاہ رکھتے تھے اور اقتصادیات، معاشیات، عمرانیات کے عمل اور اثرات سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے اپنی تنقید میں سماجی نقطۂ نظر کے ساتھ ادب کے جمالیاتی ق نفسیاتی پہلوؤں میں فنی حسن وخوبی پر بھی زور دیا ہے۔ انھوں نے اردو تنقید کو فنی وتشریحی توضیح کے دائرے سے نکال کر سائنٹفک فکر سے آشنا کیا۔''** (ترقی پسند تحریک اور اردو تنقید، تنقیدی مباحث۔شارب رودلوی، صفحہ۔44)

احتشام حسین کا شمار ان ناقدوں میں ہوتا ہے جنہیں ہر ادبی حلقے اور مختلف رجحان کے ادیب وقلم کار پسند کرتے ہیں۔ ترقی پسند ناقد ہونے کے ساتھ وہ تاریخ، سیاست، جمالیات، اقتصادیات، فلسفہ، عمرانیات اور لسانیات میں ان کی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی تنقید کا مارکسی نقطہ واضح ہے جس میں وہ کارل مارکس، لینن اور دوسرے اشترا کی فلسفیوں اور ناقدوں کے اثرات قبول کرتے ہیں اور اسے اردو تنقید میں پیش کرتے ہیں۔ احتشام حسین زندگی اور ادب کے رشتے کی مضبوطی کو سمجھتے تھے۔ انھوں نے ادب کو زندگی کا حصہ نہیں آئینہ سمجھا اور ادب میں زندگی کو ٹکڑوں میں نہیں بلکہ مکمل طور پر دیکھا کیوں کہ وہ ادب کو مسلسل اور لافانی سمجھتے تھے جو اپنے رخ کو تبدیل کر سکتا ہے مگر زندگی کی اصل بنیاد سے الگ نہیں ہوتا۔ زندگی اور ادب کے مابین یہ بنیاد دراصل انسانی زندگی اور سماج کے بیچ پیدا ہوتی ہے۔ ادب کا کوئی نہ کوئی اہم مقصد ہوتا ہے ادب محض لطف حاصل کرنے کی چیز نہیں بلکہ زندگی، انسانی مسائل اور جدوجہد کا آئینہ ہے۔ اردو تنقید میں احتشام حسین کی کیا اہمیت ہے اس بارے میں سید عقیل رضوی کہتے ہیں کہ:۔

> **''جس تحریر نے اردو تنقید کو اعتبار بخشا، جس نے ہر طرح اچھے ادب پر تفہیم کے لیے ہمدردی اور احترام کا جذبہ پیدا کیا جس نے اردو تنقید کو مغرب کے شانہ بہ شانہ کھڑا کیا، جس نے ادب کو پرکھنے میں تاریخ، خارجی حالات علم النفس کی پیچیدگیوں اور معروضی صداقتوں کو شامل کر کے اردو تنقید کی تاریخ میں فکر وسوچ کی نئی منہاج قائم کی۔ وہ احتشام حسین کی تنقید ہے۔''** (اردو تنقید مسائل ومباحث، مرتب۔پروفیسر منظر عباس نقوی، صفحہ۔213)

احتشام حسین ترقی پسند ناقد اور ادبی شخصیت کے لحاظ سے اردو ادب میں ہمیشہ اہمیت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کو فکری اعتبار سے مضبوط کیا اور اردو تنقید کو ایک منطقی، سائنسی اور سماجی فکر عطا کی۔ اردو تنقید میں ان کا مقام بلند اور مستحکم ہے۔

☆☆☆

سید محمد ظفر اقبال
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ادب اطفال میں کرشن چند کا حصہ

ادب دراصل کسی بھی قوم کی اخلاقی تربیت کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ادب مشکلوں پر قابو پانے اور مقاصد کے حصول کے لیے استقلال کا جذبہ فراہم کرنے میں مددگار رہے۔ادب اعلیٰ ظرفی کا درس دے کر تعصب وتنگ نظری کو مٹاتا ہے، جس قوم اور زبان کے پاس اپنا کوئی ادب نہیں ہوتا اس کا کوئی مستقبل بھی نہیں ہوتا۔ادب جہاں ماضی کی صالح قدروں کی حفاظت کرتا ہے، حال کو بامعنی بناتا ہے وہیں مستقبل کو روشن کرنے کا جذبہ بھی عطا کرتا ہے۔ایک اچھا ادب پارہ ماضی، حال اور مستقبل کو بہ یک وقت اپنی گرفت میں لے کر انسانی شعور کو بالیدگی عطا کرتا ہے۔ادب جہاں قومی حمیت، ایثار اور انسانی دردمندی کو فروغ دیتا ہے وہیں انسانوں کے تخیل وتصورات کو بھی بامعنی بناتا ہے۔

'ادب اطفال' بچوں کی ایک اہم ضرورت ہے۔اگر بچوں کا ادب نہ ہوتو بچوں کی زندگی بے رنگ ہوجائے گی۔بچے نئی نئی معلومات اور نئے نئے جہانوں کی سیر کے خواہش مند ہوتے ہیں۔وہ اپنے گردوپیش کی ہر چیز کا جائزہ لیتے ہیں، پیڑ پودے، زمین، آسمان، سورج، چاند، تارے، ندی، جھرنے، پھول، پتے، چرند وپرند غرض ہر ایک چیز پر ان کی نظر ہوتی ہے اور وہ ہر چیز کے بارے میں جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ان کے ذہن میں ان چیزوں کو دیکھ کر مختلف طرح کے سوالات جنم لیتے ہیں جن کا جواب وہ ان کتابوں کے ذریعہ حاصل کرسکتے ہیں۔بچوں کا ادب ان کی تعلیم وتربیت اور ذہنی نشوونما کا بہترین ذریعہ ہے۔جو بچے اپنے ادب میں دلچسپی لیتے ہیں ان کے لیے زبان اور دوسرے علوم وفنون کی تعلیم آسان ہوجاتی ہے۔ڈاکٹر بانو سرتاج بچوں کے ادب کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتیں ہیں کہ؛

> ''....کسی بھی قوم میں بچے ہی اس کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں۔بچوں کی مناسب تعلیم موزوں خطوط پر تربیت پرورش ونگہداشت سے ہم تعلیم سے بہرہ مند، ترقی یافتہ اور مفید وکارآمد قوم کی تعمیر کا تصور کرسکتے ہیں....''

(اردو میں بچوں کا ادب اس کے مسائل اور ان کا حل، ڈاکٹر بانو سرتاج؛ص۲۰، مشمولہ اردو میں ادب اطفال ایک جائزہ، مرتبہ؛ پروفیسر اکبر رحمانی)

ادب اطفال کی بنیاد مفید علوم وفنون اور اخلاقیات پر رکھنی چاہے۔علم واخلاق کے بغیر ادب اطفال کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ادب اطفال میں ایسے اخلاقی وعلمی موضوعات کو بنیاد بنانا چاہے جس سے انسانوں سے محبت، آپسی ہم آہنگی اور امن وامان قائم ہوسکے اور بچوں کے

ذہن سے آپسی نفرت، دشمنی، تعصب اور تنگ نظری وغیرہ جیسے مادے ختم ہوں تاکہ آنے والی زندگی میں وہ ایک صالح معاشرے کی تشکیل کر سکیں۔

ادب اطفال کی اہمیت وافادیت میں کوئی شبہ نہیں۔اگرچہ اب بھی اردو ادب میں اسے وہ مرتبہ وکمال حاصل نہیں ہوسکا جس کا وہ مستحق ہے۔آج بھی بہت سے علمائے ادب و نقادانِ فن بچوں کے ادب کو اہمیت نہیں دیتے اور بہت سے تو اسے ادب ہی تسلیم کرنے کو راضی نہیں۔ضیاء الرحمٰن غوثی لکھتے ہیں کہ؛

''...اردو ادب میں بچوں کے تخلیق کاروں کو کم اہمیت دی جاتی ہے۔اور اردو ادب کی تاریخ اور تنقید کی کتابوں میں ان کی خدمات کا سرسری ذکر ہی ملتا ہے...''

(بہار میں بچوں کا ادب؛ ضیاالرحمٰن غوثی:ص ۸)

ادب اطفال کے ابتداء وارتقاء پر جب ہم غور کرتے ہیں تو اس کے سراغ اردو کی ابتداء کے ساتھ ہی ملتے ہیں۔محققین نے امیر خسرو کو ان کی ''خالق باری'' اور دوسری پہلیوں و کہہ مکرنیوں کے پیش نظر اردو میں بچوں کا پہلا شاعر تسلیم کیا ہے۔امیر خسرو کے بعد قلی قطب شاہ کو بھی بچوں کا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔اس کے بعد ایک سلسلہ ہے جس میں میر تقی میر (موہنی بلی) انشاء اللہ خاں انشا (رانی کیتکی کی کہانی) نظیر اکبر آبادی (تل کے لڈو) محمد حسین آزاد (طالب علم) ڈپٹی نذیر احمد (منتخب الحکایات) مرزا غالب (قادر نامہ) سرسید (تعلیم وتربیت) حالی (مرغی اور اس کے بچے) شبلی (صبح امید) علامہ اقبال (ایک پہاڑ اور گلہری) چکبست (خاک وطن) اکبر الہ آبادی (ہونہار بیٹا) حفیظ جالندھری (ننھے منھے بچے) امتیاز علی تاج (بچوں کی بہادری) عظیم بیگ چغتائی (قصر صحرا) ڈاکٹر ذاکر حسین (ابو خان کی بکری) تلوک چند محروم (اچھا آدمی) عصمت چغتائی (سفید جھوٹ) کرشن چندر (الٹا درخت) احمد ندیم قاسمی (چوہوں کی بارات) آل احمد سرور (نئی پود) اطہر پرویز (مرغی چور) مرزا ادیب (استانی جی) جمیل مظہری (اے مادر وطن ہندوستان) عابد حسین (شریر لڑکا) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ اور بہت سے ادباء وشعراء نے ادب اطفال کو پروان چڑھایا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

کرشن چندر اردو کے اہم فکشن نگار ہیں۔ان کا شمار اردو کے اہم اور بڑے فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔اپنے ہم عصروں میں کرشن چندر نے سب سے زیادہ لکھا ہے۔انہوں نے نثر کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کا ایک خاص اسلوب نگارش ہے جو انہیں اپنے عہد کے دوسرے فکشن نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔اردو فکشن میں کرشن چندر کی ناول نگاری ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اپنی فنی خصوصیات کی وجہ سے وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں مقبول ومشہور ہوئے۔ان کے ناولوں کے تراجم ہندوستان کی تقریباً سبھی زبانوں کے علاوہ دنیا کی تمام اہم زبانوں میں ہوئے ہیں۔کرشن چندر کی شہرت ومقبولیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر محمود الٰہی لکھتے ہیں کہ؛

''کرشن چندر عوام اور خواص میں یکساں مقبول ہیں۔ان کی تخلیقات دل اور دماغ دونوں کے لیے تسکین کا سامان بہم پہنچاتی ہیں۔انہوں نے بہت کچھ لکھا۔اگر وہ شاعر ہوتے اور غزل کے شاعر، تو انہیں زود گو

اور بسیار گو کہا جاتا۔لیکن کسی حال میں ان پر پستش بغاوت کا فقرہ صادق نہ آتا۔وہ اپنی اور اپنے فن کی حدیں پہچانتے ہیں۔وہ ابتذال اور عامیانہ انداز سے دامن بچانے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اخلاقیات کا درس دینے لگتے ہیں یا وعظ و نصیحت کا دفتر کھول دیتے ہیں۔اگر ایک طرف ان کا قلم شعر و نغمہ میں ڈوبا رہتا ہے تو دوسری جانب ان کی نگاہ حقائق پر رہتی ہے۔یہی نہیں کرشن چندران فنکاروں میں ہیں جو عالمی ادبیات میں ناول وافسانوی ادب کی نمائندگی کرتے ہیں''

(پیغامات،محمود الٰہی؛شاعر بمبئی،کرشن چندر نمبر ۱۹۶۷ء ص ۲۴)

کرشن چندر نے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی کامیاب ادب تحریر کیا ہے۔انہوں نے اپنی کہانیوں،افسانوں،ناولوں اور ڈراموں کے ذریعہ بچوں کی ہمہ جہت معلومات،ذہنی و جسمانی نشوونما اور ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔کرشن چندر نے بچوں کے لیے فنطاسیہ،مہماتی اور سائنسی فکشن تخلیق کیا۔انہوں نے اپنی تخلیقات میں شعریت آمیز نثر کا استعمال کیا ہے۔ان کی زیادہ تر کہانیاں تمثیلی اور طنزیہ ہیں جن میں مزاح کی چاشنی سے مقصدیت کو خوشگوار بنایا گیا ہے۔ان کا شعریت آمیز رومانی انداز اور حسین مناظر کی تصویرکشی بچوں کو اپنی گرفت میں لیے رہتی ہے۔بچوں کے ادب میں کرشن چندر کے مقام و مرتبے پر گفتگو کرتے ہوئے جیلانی بانو لکھتیں ہیں کہ؛

''اردو ادب میں بچوں کے لیے جو ادب لکھا گیا ہے وہ عموماً جادوگرں،پریوں اور بھوتوں کی کہانیوں کی شکل میں ہے۔کرشن چندر نے بچوں کے لیے جو کہانیاں اور ناول لکھے ہیں وہ مختلف ڈھنگ کے ہیں۔انہوں نے بچوں کی دلچسپی برقرار رکھنے والی طلسماتی فضا استعمال کی ہے لیکن اس فضا اور محیر العقول کرداروں کے ذریعے اپنی بات کہی ہے۔انہوں نے جادوگروں جن پریوں کو نیا روپ،نئی شخصیت اور نئے معنی دیے ہیں اور ان کے توسط سے عصری سماجی اور تہذیبی مسائل کو بچوں کے ذہنوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔''

(ہندوستانی ادب کے معمار کرشن چندر۔مرتبہ جیلانی بانو،ص ۵۹)

کرشن چندر کی اہم اور مقبول کہانیوں میں 'چڑیوں کی الف لیلیٰ'،'بیوقوفوں کی کہانیاں'،'سونے کی صندوقچی'،'سونے کا سیب'،'شیطان کا تحفہ'،'لال تاج'،'الٹا درخت' وغیرہ اہم ہیں جو اب کتابی صورت میں موجود ہیں۔کرشن چندر کی زیادہ تر طویل کہانیاں اور ناول ماہنامہ ''کھلونا''،نئی دہلی میں قسط وار شائع ہوئیں،جس کے نتیجے میں بچہ بچہ ان کے نام سے واقف ہوگیا اور ان کی یہ کہانیاں محض لائبریریوں کی زینت بننے سے بچ گئیں۔الٹا درخت(ستمبر ۱۹۳۵ء)ستاروں کی سیر(اکتوبر ۱۹۵۷ء)ماہنامہ کھلونا نئی دہلی میں قسط وار شائع ہوئیں اور پھر بعد میں کھلونا بکڈپو نئی دہلی نے ہی اہتمام کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا۔ستاروں کی سیر کا نیا ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع ہوا۔مکتبہ جامعہ سے ہی کرشن چندر کی دوسری طویل کہانی ''خرگوشوں کا سپنا'' ۱۹۶۵ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔

کرشن چندر کی زیادہ تر کہانیاں تمثیلی اور طنزیہ انداز کی ہیں جن میں مزاح کی چاشنی سے مقصدیت کو خوشگوار انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔انہوں نے اپنے ناول ''ستاروں کی سیر'' میں بچوں کو نئے نئے جہانوں کی سیر کرائی ہے اور تفریح کے پردے میں بچوں کو جدید سائنسی ایجادات اور کائنات کے اسرار سے روشناس کرایا ہے۔ان کی کہانی ''ستاروں کی سیر'' سے اقتباس ملاحظہ ہو؛

''...آہا دوستو! کیا بیان کروں میں چاند کی دوسری طرف کا حال چاند کا یہ ہماری طرف والا رخ جتنا ہی اجڑا اور ویران تھا۔اس کے دوسری طرف اتنی ہی شادابی اور پر بہار فضا تھی۔تمام سطح زمین پر نیلے رنگ کی گھاس اگی ہوئی تھی۔بھوری مٹی کہیں بھی نظر نہ آتی تھی۔جگہ جگہ خوب صورت درختوں کے کنج تھے،اور ہر درخت کی اپنی خوشبو تھی۔کوئی گلاب کی طرح مہکتا تھا تو کسی میں سے موتیئے کی خوشبو آتی تھی۔تمام پتوں کا رنگ سنہرا تھا اور تمام پھول سفید تھے ندی نالوں میں پگھلی ہوئی چاندی بہتی تھی۔بادلوں کا رنگ گلابی تھا بادل آسمان پر بہت اونچے نہیں اڑتے تھے۔بلکہ درختوں کی چوٹیوں کو چھو کر نکلتے تھے ان میں سے پانی کے بجائے موسیقی کی بارش ہوتی تھی اور دھیمے دھیمے سروں میں خوب صورت راگ ہر وقت برستے رہتے تھے۔جیسے ہی موسیقی کی یہ بارش زمین پر ہوتی،کسان لوگ کھیتوں میں ہل چلانے لگتے۔دیکھتے ہی دیکھتے موسیقی کے پودے بڑے بڑے ہو جاتے۔یہاں کے کسانوں کو فصل اگانے کے لئے زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔پودے آپ ہی آپ بڑے ہوتے رہتے۔ہل چلانے کے بعد کسانوں کو دن میں تین دفعہ اپنے کھیتوں میں بانسری بجانا پڑتی تھی۔بانسری کی آواز سن سن کر پودے بڑھتے رہتے تھے۔کوئی کسان بانسری بجاتا تھا تو کوئی جلترنگ،کوئی ستار تو کوئی رباب...''

(ستاروں کی سیر،مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی،ص:۵۵،۵۴)

چڑیوں کی الف لیلیٰ،سونے کی صندوقچی،سونے کا سیب،شیطان کا تحفہ اور الٹا درخت اردو میں بچوں کی بہترین فنطاسی کہانیاں ہیں جو اپنے دلکش اسلوب اور انداز بیان کے سبب بچوں اور بڑوں دونوں میں مقبول ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ''الٹا درخت'' ہمارے خود غرض اور مفاد پرست سماج پر زبردست طنز ہے جس کا اندازہ کہانی کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے؛

''....پھر یہ ہوا کہ قتل کرنے کے بعد بھی اور جیل میں ڈال دینے کے بعد بھی ان شاعروں اور ادیبوں اور سیاست دانوں کی آواز نہیں رکی اور ملک میں گونجتی رہی اس لئے بادشاہ نے ہم تمام آوازوں کو بھی پکڑ لیا ہے۔اور اس گنبد میں بند کر دیا ہے۔اب اس کا خیال ہے کہ یہ آوازیں ہمیشہ کے لیے دبا دی گئی ہیں اور اب اس کو ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہے،۔۔۔ہا۔ہا۔ہا۔ہا۔بادشاہ کس قدر بے وقوف ہے...''

(الٹا درخت،مطبوعہ رجت بک ہاؤس دہلی۔ص:۲۶)

کرشن چندر کی کہانی ''الٹا درخت'' سے ہی ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ایک صنعت کار کے اکلوتے بیٹے کی زبانی انہوں نے کس خوبصورتی کے ساتھ مفاد پرستی، خود غرضی، لالچ، لوٹ کھسوٹ اور عوام کے استحصال کی صورت حال کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے؛

''...سنو تو' لڑکے نے کہا'۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ جب سب کام مشین کرنے لگیں۔ اور سب طرف بیکاری اور بھوک بڑھنے لگی تو لوگ مرنے لگے۔ مگر پتا جی بہت خوش تھے کیوں کہ ان کا نفع بڑھ رہا تھا۔ پھر ایک دن وہ آیا کہ قحط سے بازار کے بازار خالی ہو گئے۔ بازاروں میں سب سامان تھا۔ مگر لوگوں کے پاس خریدنے کو پیسہ نہ تھا۔ اس لئے تھوڑے دنوں میں لوگ ہزاروں کی تعدا میں بھوک سے مر گئے۔ بہت سے لوگ بغاوت میں مارے گئے جو بچے وہ شہر سے بھاگ گئے۔ ایک دن اس شہر میں صرف تین آدمی رہ گئے۔ میں اور میرے پتا جی اور میری ماتا جی۔ پھر میرے پتہ جی نے خودکشی کر لی کیوں کہ اس شہر میں اب کوئی آدمی نہ رہا تھا اس لئے اب انہیں نفع بھی نہ ہوتا تھا۔ تم جانتے ہو نفع مشینوں سے نہیں، آدمیوں سے ہوتا ہے۔ جب کوئی آدمی ہی نہ رہا تو پتا جی کس سے نفع کماتے! آخر میں بے چارے میرے پتا جی اس غم کو سہارا نہ کر سکے اور خودکشی کر کے مر گئے۔ تین سال ہوئے۔۔۔ میری ماتا جی بھی چل بسیں۔ تب سے میں اس شہر میں اکیلا ہوں۔ اور مشینوں کے بٹن دبا تا رہتا ہوں۔ یا فرصت میں سینما دیکھتا ہوں۔ مگر کوئی تصویر بھی ایسی نہیں ملتی جو بچوں کے لئے ہو۔ اس لئے میں نے تنگ آ کر سب فلم ڈائرکٹروں کو الو بنا کر درخت پر رکھ دیا ہے۔ تم نے راستے میں ان کو دیکھا ہو گا۔؟''

(الٹا درخت، مطبوعہ رجت بک ہاؤس دہلی۔ ص:۴۳، ۴۴)

''الٹا درخت'' کرشن چندر کا سب سے اچھا اور خوبصورت ناولٹ ہے جس میں انہوں نے بہت سے نئے تجربات کیے ہیں۔ یہ تجربے ہئیت اور مواد ہر دو سطح پر ہوئے ہیں جس کے نتیجے میں اردو میں ایک بہترین فنطاسی کا اضافہ ہوا ہے۔ دیوسرن شرما اپنے دیباچہ میں کہانی کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ؛

''...اس ناول کا مواد بھی کچھ عجب مرکب ہے۔ اس میں بچوں کی روایتی کہانیوں کے دیو بھی ہیں، جادوگر بھی ہیں، خضر نما رحم دل بوڑھا بھی ہے، سلیمانی ٹوپی اور اڑنے والی چھڑی بھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں جادوگر الیکشن بھی لڑتے ہیں اور فلم ڈائرکٹر الو بنے نظر آتے ہیں اور مشینوں کے شہر میں سرمایہ دار کا اکلوتا بیٹا مشینوں کے بٹن دباتا نظر آتا ہے۔ ایک معصوم قاری کے لئے یہ عجیب وغریب اور دلچسپ داستان ہے۔ بچوں کے لئے اس میں دلچسپی کا پورا مواد موجود ہے لیکن پھر بھی یہ تخلیق سنجیدہ ادب Serious Literature کا ایک شاہکار ہے...''

(دیباچہ؛الٹادرخت،مطبوعہ رجت بک ہاؤس دہلی۔ص:۵)

کرشن چندر نہ صرف فنطاسی، مہماتی اور سائنسی فکشن لکھنے میں بے مثال ہیں بلکہ انہوں نے بچوں کی عام زندگی کو بھی اپنی تحریروں میں فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔''بیوقوفوں کی کہانیاں''اس کی عمدہ مثال ہے جس میں 'بیوقوف نمبر دار' 'بیوقوف بڑھیا' 'بیوقوف امیر' اور 'بیوقوف بھیڑیا' جیسی چار کہانیاں شامل ہیں۔ یہ کہانیاں بچوں کی تفریح طبع کے لیے مزاحیہ پیرائے بیان میں لکھی گئی ہیں۔ ناول اور طویل کہانیوں کے علاوہ انہوں نے بہت سی مختصر کہانیاں اور ڈرامے بھی لکھے ہیں جن میں کہانی ''ہمارا گھر''اور ڈرامہ''گیند'' قابل ذکر ہیں۔

کرشن چندر کی بیشتر کہانیوں میں انسانی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ بچے فرضی کہانی کو بھی حقیقی زندگی کا جز و سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں بچوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب بچوں کے مزاج اور مذاق سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ غرض جدید سائنسی اور صنعتی دنیا کے پس منظر میں ان کی کہانیاں، ناول اور ڈرامے اپنے شاعرانہ اور رومانی طرز نگارش کی بنیاد پر لافانی شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔

☆☆☆

ANWAR-E-TAHQEEQ

(Multilingual & Multidisciplinary Peer Reviewed Refereed Monthly Magazine from Qila-e-Golconda, Hyderabad, Deccan)

Volume:-8, Issue:- 7 to 9

July To September 2021

Price: Monthly:-50rs., Annual:- 500rs.

Supervision

Dr. Syed Adil Ahmad, Department of Archaeology, State Museum, Hyderabad Telangana

Editor

Syed Iliyas Ahmad Madni,

Honorary Editors:

Professor Sahebzada Saulat Ali Khan

Professor E. A. Haidari

Address:-

9-10-389, Neem Bowli, Masjid, Kathora House, Golconda Fort, Hyderabad, Telangana- 500 008

Mob:- 09966647580 Email:- anwaretahqeeq@gmail.com

Review Committee

Prof. Masood Anwar Alavi, AMU, Aligarh
Prof. Umar Kamaluddin, LU, Lucknow
Prof. Aziz Bano, MANUU, Hyderabad
P. Anuradha Reddy, Intex, Telangana, Hyderabad
Dr. Zareena Perveen, Director of Archieves, Hyd.
Dr. S. Asmath Jahan, MANUU, Hyderabad
Dr. M. A. Naeem, Hyderabad
M.A. Ghaffar, caleographer, AIwan-e-Urdu, Hyd.
Kishore Jhunjhunwala, Expert of coins, Mumbai
Amarbeer Singh, Expert of coins, Hyderabad

Editorial Board

Prof. S. M. Asad Ali Khurshid, AMU, Aligarh
Prof. Shaid Naukhez Azmi, MANUU, Hyderabad
Dr. Mohd. Aqeel, BHU, Varanasi
Dr. Md. Ehteshamuddin, AMU, Aligarh
Dr. Mohd. Qamar Alam, AMU, Aligarh
M. Tauseef Khan Kaker, AMU, Aligarh
Ahmad Naved Yasir, AMU, Aligarh
Sheikh Abdul Raheem, JIH, Hyderabad
Mutabbi Ali Khan, Editor Urdu Khabar.in, Hyderabad

Articles

	Article	Author	Pg.
1	संडीला की दरगाहों का एक संक्षिप्त अवलोकन	अतिफ़ा जमाल	3
2	History of Sandila: A Cultural and -------	Zeha Khan	11

अतिफ़ा जमाल

शोधार्थी, फ़ारसी विभाग, लखनऊ विश्वविद्यालय, लखनऊ

संडीला की दरगाहों का एक संक्षिप्त अवलोकन

उत्तर प्रदेश के हृदय प्रदेश में स्थित संडीला एक ऐसा नगर है जिसकी पहचान केवल उसके भूगोल, इतिहास या व्यापार तक सीमित नहीं है, बल्कि इसकी वास्तविक आत्मा उन सूफ़ी दरगाहों में बसती है जो सदियों से यहाँ की मिट्टी को आध्यात्मिकता, प्रेम, सद्भाव और इंसानी रिश्तों की गर्माहट से सींचती चली आ रही हैं। संडीला की दरगाहें केवल धार्मिक स्थलों का नाम नहीं हैं; वे इस बात की जीवित मिसाल हैं कि हिन्दू और मुसलमान दोनों समुदाय किस प्रकार साझा संस्कृति, अदब, मिल-जुलकर जीने की परंपरा और समान आस्था का एक अनोखा जामा तैयार कर सकते हैं। यही कारण है कि संडीला की दरगाहों की फिज़ा में आज भी वह पुरानी तहज़ीबी मिठास, वह अपनापन और वह जिस्म-ओ-जाँ को छू लेने वाली रूहानियत महसूस की जा सकती है, जिसके लिए हिंदुस्तानीय सूफ़ियत विश्वभर में जानी जाती है।

संडीला का इतिहास अत्यंत प्राचीन है और यहाँ के क़दम-क़दम पर अतीत की परतें बिछी हुईहैं। यह नगर लंबे समय तक एक सांस्कृतिक केंद्र रहा, जहाँ साहित्य, संगीत, कला, व्यापार और अध्यात्म का गहरा

संगम देखने को मिलता रहा है। इसी धरती पर कई सूफ़ी संत आए, रहे, उपदेश दिया, प्रेम और भाईचारे की शिक्षा दी और फिर यहीं सुपुर्दे-ख़ाक हुए। इन्हीं संतों के मज़ार आज भी संडीला के लोगों के लिए प्रेरणा का स्रोत, सुकून की जगह और आस्था व आदर का प्रतीक बने हुए हैं।

इन दरगाहों की महत्ता इस बात में भी निहित है कि लोग किसी विशेष धर्म, जाति या भाषा के आधार पर नहीं, बल्कि केवल दिल की सच्चाई, मुरादों की ख्वाहिश और संतों से मोहब्बत लेकर यहाँ आते हैं। संडीला की दरगाहों की यात्रा एक तरह से रूहानी सफ़र भी है। जैसे-जैसे कोई व्यक्ति इन पवित्र स्थलों की चौखट तक पहुंचता है, उसके मन में एक अजीब-सी शांति उतरने लगती है। दरगाहों तक पहुँचनेवाले रास्तों पर प्रायः सुगंधित अत्तर बेचने वाले, चादरें और फूलों की दुकानें, मीठी आवाज़ में गाते नात-मनक़बत, दुआ माँगते हाथ और झुकते हुए सिर—ये सब मिलकर एक ऐसी रूहानी छवि बनाते हैं जो व्यक्ति के मन को श्रद्धा से भर देती है। दरगाहों की वास्तुकला भी देखने योग्य है—पुराने ज़माने की नफ़ासत, मुगल और नवाबी दौर की झलक, गुलाबी और हरे रंग की पारंपरिक पच्चीकारी, गुंबदों की गोलाई और लहराती हुई पताकाएँ इन स्थलों को और भी मोहक बनाती हैं।

संडीला की प्रमुख और ऐतिहासिक दरगाहों में सबसे प्रसिद्ध है **हजरत ख्वाजा फख़्रुद्दीन चिश्ती रहमतुल्लाह अलैह** की दरगाह। यह दरगाह संडीला की सूफ़ी परंपरा का केंद्र मानी जाती है। ख्वाजा साहब चिश्ती सिलसिले के एक प्रतिष्ठित बुज़ुर्ग थे, जिनका जीवन त्याग, प्रेम, समानता और आध्यात्मिक एकता पर आधारित था। कहा जाता है कि

उनके पास आने वाला हर व्यक्ति—चाहे वह राजा हो या रंक—एकसमान व्यवहार और एकसमान दया पाता था। उनकी खानकाह में गरीबों की सेवा, भूखों को खाना खिलाने की परंपरा और मेहमाननवाज़ी का इतना गहरा असर था कि लोग दूर-दूर से केवल उनकी संगत पाने के लिए आते थे। विशेष अवसरों पर आज भी इस दरगाह में फ़ूलों की ख़ुशबू, कव्वालों की दिलकश आवाज़ और श्रद्धालुओं की भीड़ एक ऐसा माहौल तैयार कर देती है जो दिल को छू लेता है।

दरगाह में प्रवेश करते ही सबसे पहले जिस चीज़ का अनुभव होता है, वह है शांत वातावरण में घुला हुआ इत्र और गुलाब की महक। संगमरमर के ठंडे फर्श पर धीरे-धीरे चलते कदम स्वयं को किसी आध्यात्मिक दुनिया में पाते हैं, जहाँ सांसारिक शोर-शराबा मानो कहीं पीछे छूट चुका हो। मज़ार पर चढ़ती चादरें, हरियाली व लाल रंग का मिश्रण, झूमर की मंद रोशनी और ऊपर उड़ते कबूतर—ये दृश्य इंसान को एक अलग ही दुनिया में ले जाते हैं। ऐसा प्रतीत होता है कि इस स्थान पर हर दुःख, हर पीड़ा, हर उलझन धीरे-धीरे पिघलने लगती है। दुआ के लिए उठे हाथों में कोई मजबूरी, कोई मन्नत, कोई आशा सुबकते हुए शामिल हो जाती है, और व्यक्ति महसूस करता है कि उसकी आवाज़ सीधे उस रूहानी शक्ति तक पहुँच रही है जिसने सदियों से इस धरती पर लोगों की मुरादें पूरी की हैं।

संडीला की दरगाहों में एक और नाम अत्यंत आदर से लिया जाता है—**हज़रात बड़े मखदूम साहब** की दरगाह का। यह दरगाह अपनी सादगी और गहन आध्यात्मिक प्रभाव के लिए प्रसिद्ध है। यहाँ किसी प्रकार का दिखावा नहीं, न शोर-शराबा और न ही भीड़ का कोलाहल; बल्कि एक

शांत, स्थिर और ध्यानपूर्ण वातावरण जहां हर आने वाला व्यक्ति कुछ पल के लिए स्वयं को संसार से अलग महसूस करता है। बड़े मखदूम साहब को संडीला और आसपास के क्षेत्रों में एक ऐसे संत के रूप में माना जाता है जिन्होंने अपने जीवन का बड़ा भाग लोगों की समस्याएँ सुनने, उन्हें सलाह देने और उनके दुखों को कम करने में बिताया। कहा जाता है कि उनकी निगाह में कोई बड़ा या छोटा नहीं था। सामाजिक असमानताओं वाली दुनिया में उनका संदेश—सरल, मानवीय और बेहद प्रभावकारी था: इंसानियत ही सबसे बड़ा धर्म है और प्रेम ही सबसे बड़ी इबादत।

इस दरगाह की फिज़ा में गहरी खामोशी है, लेकिन यह खामोशी भय की नहीं बल्कि सुकून की है। यहाँ लोग लंबे समय तक सजे हुए आँगन में बैठे रहते हैं, मज़ार के पास सर झुकाकर दुआ करते हैं और मन ही मन उस आध्यात्मिक ऊर्जा को महसूस करते हैं जो चारों ओर फैली होती है। कई श्रद्धालु बताते हैं कि इस दरगाह पर आकर मन का बोझ हल्का हो जाता है। उनकी भाषा में कहें तो "दिल का पर्दा साफ हो जाता है," और यही बात इस जगह की सबसे अनोखी विशेषता है। यहाँ आने वाला व्यक्ति बिना कहे, बिना माँगे ही अपने मन की बात इस रूहानी वातावरण में उंडेल देता है।

संडीला की दरगाहों का एक और उल्लेखनीय पहलू यह है कि वे न केवल धार्मिक स्थल हैं बल्कि सामाजिक सद्भावना, सांस्कृतिक वार्ता और मनुष्यता की साझी धरोहर का जीवंत उदाहरण भी हैं। यहाँ हिंदू, मुसलमान, सिख, ईसाई सभी एक ही लाइन में खड़े होकर चादर चढ़ाते

हैं, धूप जलाते हैं, दुआ करते हैं और संतों से बरकत माँगते हैं। कई हिंदू परिवारों में यह परंपरा पीढ़ियों से चली आ रही है कि किसी भी शुभ कार्य—जैसे नया घर बनाना, शादी, संतान प्राप्ति—के अवसर पर सबसे पहले दरगाह जाकर चादर चढ़ाई जाती है। यह मिल्लत और तहज़ीब का वही अनोखा संगम है जिसने सदियों से भारत की धरती को अनूठी पहचान दी है।

संडीला की दरगाहों में होने वाले उर्स की बात भी बड़ी दिलचस्प है। उर्स का अवसर दरगाहों में एक रूहानी उत्सव का रूप ले लेता है। दूर-दूर से श्रद्धालु आते हैं, रास्तों में दुकानें सजती हैं, कव्वालों की महफ़िलें जमती हैं, और रातभर सूफ़ी संगीत की वह सरगम गूंजती रहती है जो दिल के तारों को छू जाती है।

सूफी संगीत का मख़सूस आलम—ढोलक की मधुर थाप, हारमोनियम की उठती गिरती लहरें, और "अल्लाह हू" की पुकार—संडीला की दरगाहों के उर्स को किसी आध्यात्मिक महोत्सव से कम नहीं बनाते। उर्स के दिनों में आसपास का पूरा इलाका जैसे एक ही रंग में रंग जाता है—प्रेम, मोहब्बत और इंसानियत के रंग में। संडीला की दरगाहें केवल इतिहास या आस्था के लिए ही महत्त्वपूर्ण नहीं हैं, बल्कि आज भी सामाजिक जीवन में उनकी भूमिका बेहद अहम है। जरूरतमंदों की मदद, भोजन का वितरण, गरीबों की सहायता, रोगियों के परिवारों को सहयोग, और बच्चों की शिक्षा तक में ये दरगाहें किसी न किसी रूप में योगदान करती हैं। इनके प्रबंधन में शामिल लोग इस बात का विशेष ध्यान रखते

हैं कि संतों की सीख—सेवा, प्रेम, समानता और सहयोग—आधुनिक समय में भी उतनी ही जीवित रहे जितनी सदियों पहले थी।

दूसरी ओर, संडीला की दरगाहों की वास्तुकला भी अध्ययन का विषय है। इनमें मुगल, अफ़ग़ानी और हिंदुस्तानी स्थापत्य का अनोखा मिश्रण देखने को मिलता है। पुराने समय की नक्काशी, नाजुक जालीदार खिड़कियाँ, गुंबदों की ऊँचाई, दरगाहों के आँगन में लगे बरगद या नीम के पेड़, और पत्थरों पर उकेरी गई आयतें—ये सब इतिहास को जीवित रखने में महत्त्वपूर्ण भूमिका निभाते हैं। मज़ार पर बिछी पत्तियाँ, लहराते परचम, दरगाह की दीवारों पर उभरते पुराने रंग और समय का असर—ये सब मिलकर एक ऐसी भावना जगाते हैं जो आधुनिक वास्तुकला में नहीं मिल सकती।

जो लोग शोध के उद्देश्य से संडीला की दरगाहों का दौरा करते हैं, वे यह पाते हैं कि यहाँ केवल धर्म नहीं बल्कि भूगोल, इतिहास, समाजशास्त्र, कला, संगीत और साहित्य—all in one—एक ही स्थान पर जीवित स्वरूप में मौजूद हैं। इन दरगाहों ने समय के विभिन्न उतार-चढ़ाव देखे हैं: राजनीतिक परिवर्तन, सामाजिक बदलाव, शासन व्यवस्थाओं का उठना और गिरना, मगर इन सबके बावजूद दरगाहों की रूहानी ताकत और उनका सामाजिक प्रभाव आज भी उतना ही गहरा है जितना सदियों पहले था।

दरगाहों के आसपास रहने वाले लोग भी इन स्थलों के वातावरण में विशेष भूमिका निभाते हैं। उनके व्यवहार में एक नरमाहट, बातचीत में

एक अदबी अंदाज़ और मेहमानों के प्रति एक सहज सम्मान देखने को मिलता है। वर्षों से यह परंपरा चली आ रही है कि दरगाह में आने वाले हर मेहमान का स्वागत खुले मन और खुले दिल से किया जाए। इधर उधर बिकते मीठे फलों, गरम जलेबियों, सेवईयों और कासूरी मेथी की खुशबू दरगाहों के आसपास की फिज़ा में अलग ही रंग भर देती है। यह सब कुछ केवल धार्मिक अनुभव ही नहीं बल्कि सांस्कृतिक अनुभव भी बन जाता है।

संडीला की दargahों का सबसे अनोखा प्रभाव शायद यह है कि यहाँ आकर व्यक्ति स्वयं के भीतर झांकने लगता है। इस आध्यात्मिक स्थान पर खड़े होकर उसे अपनी गलतियाँ, कमज़ोरियाँ, और खुद से किए हुए वादे याद आते हैं। वह महसूस करता है कि यहाँ दुआ केवल हाथ उठाने का नाम नहीं, बल्कि आत्मा को शुद्ध करने की प्रक्रिया है। इस प्रक्रिया में कई बार वह अपने मन की बेचैनी, अपने दर्द और अपनी उलझनों को आँसुओं की शक्ल में बाहर निकाल देता है और हल्का महसूस करता है। यही आध्यात्मिक शांति इन दरगाहों का सबसे बड़ा वरदान है।

समय बदलता है, पीढ़ियाँ बदलती हैं, आदतें बदलती हैं, लेकिन संडीला की दरगाहें आज भी वैसे ही खड़ी हैं जैसे हमेशा से थीं—चौकस, शांत, रूहानी और प्रेम से भरी हुई। आधुनिकता के इस युग में भी ये स्थान लोगों को यह एहसास कराते हैं कि इंसानी रिश्तों, संवेदनाओं और आध्यात्मिकता की कद्र कभी कम नहीं होती। ये दरगाहें संडीला का गौरव हैं, और इस नगर की पहचान का सबसे खूबसूरत अध्याय भी। यहाँ आने

वाला हर व्यक्ति एक संदेश लेकर लौटता है—मोहब्बत ही सबसे बड़ी दुआ है, और इंसानियत ही सबसे बड़ा धर्म।

Zeha Khan

Aligarh

History of Sandila: A Cultural and Medieval Landmark of Awadh

Abstract:

Sandila, located in Hardoi district of Uttar Pradesh, represents one of the region's oldest qasbas (small urban centers) and has played a significant role in the religious, socio-economic, and administrative landscape of Awadh since at least the early medieval period. This paper synthesizes historical, archaeological, and literary evidence to trace Sandila's origins, its development under the Delhi Sultanate and the Mughal Empire, its socio-cultural transformation under the Nawabs of Awadh, and its evolution during the colonial and postcolonial phases. Emphasis is placed on Sandila's Sufi heritage, settlement patterns, artisanal traditions, and agrarian base.

Introduction

Small towns or qasbas have historically played an important role in northern India, often serving as nodes of religious learning, artisanal production, and local governance. Sandila exemplifies this pattern. Although overshadowed by larger urban centers such as Lucknow or Kanpur, Sandila's historical trajectory offers

a lens through which to view Awadh's broader socio-political dynamics. This study examines Sandila's history from its early settlement to contemporary times, drawing upon chronicles, local traditions, district gazetteers, and ethnographic accounts.

The origins of Sandila are rooted primarily in local oral traditions and scattered references in medieval chronicles. Some traditions associate the area with early Islamic adventurers linked to **Salar Masud Ghazi** (d. 1034 CE), whose narratives are widespread across the Gangetic plain. Although historical evidence for direct involvement is limited, these narratives indicate early Muslim presence and settlement.

The name "Sandila" has been interpreted variously in local traditions, including derivations from early clan names or pastoral groups who inhabited the region prior to large-scale urbanization. The absence of precise textual evidence necessitates reliance on archaeological and settlement studies, which suggest continuous habitation by the **11th–12th centuries CE**.

Under the **Delhi Sultanate (13th–16th centuries)** and later the **Mughal Empire (16th–18th centuries)**, Sandila emerged as an important qasba with administrative relevance. Its strategic position between Lucknow, Kannauj, and the Ganges Valley trade routes contributed to the growth of agrarian markets and the anchoring of local power structures.

District gazetteers describe Sandila as a place of notable **zamindari families**, including Sayyids, Pathans, and Shaikhs, whose presence shaped local governance. The construction of mosques, graveyards, and neighborhood clusters during this era reflects a stable and diversified urban society.

Sandila developed into a center of **weaving, pottery, and metal crafts**, common occupational specializations of qasbas during the Mughal period. Artisans produced textiles suited for local consumption and regional markets. Grain trade flourished due to fertile agricultural surroundings.

From the **13th century onward**, Sandila became a locus of Sufi activity, particularly associated with the **Chishti** and other mystic orders. Sufi saints played key roles in social integration, mediation, and spiritual pedagogy. Their khanqahs attracted disciples, travelers, and scholars.

Local tradition identifies several revered figures whose shrines continue to serve as focal points of pilgrimage:

- **Makhdoom Saaduddin**
- **Syed Qutbuddin**
- Various Chishti and Qadiri practitioners established in the region

These shrines helped define Sandila's spiritual geography, fostering syncretic practices, annual *urs* commemorations, and the development of educational institutions teaching Persian and later Urdu.

During the 18th and early 19th centuries, under the **Nawabs of Awadh**, Sandila continued to thrive. Nawabi patronage maintained mosques, shrines, and civic structures. The region became further integrated into the expanding Awadhi cultural and administrative framework.

The Nawabi era saw flourishing:

- **Persianate culture**, including poetry and manuscript learning
- **Handloom weaving**, particularly *dasuti* and coarse cotton textiles
- The strengthening of merchant networks and grain markets

Given its proximity to Lucknow, Sandila benefited from the intellectual and cultural dynamism of the Awadh court.

Under British rule, Sandila was incorporated into Hardoi district administration. The **Hardoi District Gazetteer (1904 and later editions)** provides detailed accounts of land revenue settlements, demographic changes, and occupational structures, indicating Sandila's enduring importance as a market town.

Colonial rule introduced:

- English and vernacular schools
- Standardized administrative institutions
- New revenue policies affecting zamindari structures

Urban morphology also changed through the development of roads and regulated markets.

Though not a major center of rebellion, Sandila contributed to broader national movements through local activists, clerics, and student networks who participated in **Non-Cooperation**, **Khilafat**, and **Quit India** activities.

Post-1947 transformations include:

- Growth of educational institutions
- Strengthening of agricultural markets
- Expansion of textile crafts such as **Sandila dasuti**
- Gradual integration with regional trade linked to Hardoi and Lucknow

Sandila gained administrative prominence as a **tehsil headquarters**.

Despite modernization, the town retains a rich collection of:

- Sufi dargahs
- Historic mosques and graveyards
- Old mohallas with traditional urban layout

Cultural festivals, especially Sufi *urs*, continue to shape community identity.

Sandila's history encapsulates the evolution of a north Indian qasba from an early medieval settlement to a center of Sufi spirituality, artisanal production, and local governance. Its trajectory reflects the layered political and cultural dynamics of Awadh—from Sultanate to Mughal to Nawabi to colonial rule, and finally to the postcolonial state. As modernization accelerates, Sandila's historical heritage remains a vital resource for understanding the region's identity and socio-cultural resilience.

References:

1. **Government of the United Provinces.** *Hardoi District Gazetteer*. Allahabad: Government Press, various editions (1904, 1925).

2. Hasan, Farhat. *State and Locality in Mughal India: Power Relations in Western India, c. 1572–1730*. Cambridge University Press, 2004.

3. Alam, Muzaffar. *The Crisis of Empire in Mughal North India*. Oxford University Press, 1986.

4. Eaton, Richard M. *The Rise of Islam and the Bengal Frontier, 1204–1760*. University of California Press, 1993.

5. Ghosh, S. *The Encyclopaedia of Indian Qasbas*. New Delhi: Concept Publishing, 2012.

6. Robinson, Francis. *Separatism Among Indian Muslims: The Politics of the United Provinces' Muslims, 1860–1923*. Cambridge University Press, 1974.

7. Srivastava, A.L. *Medieval History of India (Islamic Period)*. Shiva Lal Agarwala & Co., 1952.

8. Husain, Iqbal. *Sufism and Islamic Culture of India*. Manohar Publishers, 2017.

***